www.urducouncil.nic.in

مارچ 2025 ، قیمت :- 15 ₹

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 25 روپے، سالانہ: 240 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 13 شمارہ: 03 مارچ 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /15 روپے، سالانہ/145 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی- 110066
فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد- 500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
روزہ کشائی	رئیس صدیقی	07
اشارے کی زبان اور اس کے فوائد	عظیم اقبال	10
نظمیں		
ہولی	مسعودہ حیات	12
بچوں کے لیے گیت	عزیز انصاری	13
بٹیا پیاری	رحیم رضا	14
بچے گلشن کے پھول	انور آفاقی	15
پہاڑی کے دامن میں	عطاء الرحمن طارق	15
چلو ہم پڑھیں...	تبسم سحر	16
کوا	وسیم احمد نگرامی	17
علم	محمد توقیر عالم نظمی	18
ابو جی کی جیب	فہیم احمد	19
سب سے پیارا ہندوستان	رخشاں ہاشمی	20
خود کو ہم قابل بنائیں	کلیم رہبر	21
کہانیاں		
مہاراجہ کے کپڑے	اظہر افسر	22
دودھ کی چوری	اقبال برکی	27
پوں پوں والے انکل	پرویز مانوس	30
موبائل فون	عادل حیات	33
عیدو	محمد نجیب پاشا	38
فیصل اور چیونٹی	محمد رہبر عالم	41
وقت کی اہمیت	غلام قادر	44
قسط وار ناول		
جنگل کی کہانی رمیش نارائن تیواری	مترجمہ : زینت شہریار	47
سائنس		
خلا کے مسافر	جے پرکاش بھارتی	54
واقفیت عامہ		
تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات		58
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		59
ننھے فنکار		
پینٹنگ		60

پیارے بچو! وقت کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ وقت چلا گیا تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا، اس لیے ہمیں وقت کی قدر کرتے ہوئے اس کے صحیح استعمال پر توجہ دینا چاہیے۔ وقت قدرت کا بیش قیمت اور انمول تحفہ ہے۔ یہ سب کو برابر ملتا ہے۔ وقت نہ تو کبھی رکتا ہے اور نہ ہی کسی کا انتظار کرتا ہے۔ ہم نے وقت کا صحیح استعمال کیا یا نہیں، اس کا محاسبہ بھی ضروری ہے۔ وقت کا مثبت استعمال کر کے ہی ہم کامیاب و کامران ہو سکتے ہیں۔ یہ کہاوت عام ہے کہ 'وقت کی پابندی کامیابی کی کنجی ہے'۔ ہم سب کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی قیمت کو سمجھیں اس کی قدر کریں اور فضول کاموں میں وقت برباد نہ کریں، جس نے بھی وقت کو قیمتی چیز سمجھا اور اس کی اہمیت کو جانا تو وقت بھی اس کی قدر کرتا ہے اور اسے عروج عطا کرتا ہے۔ وقت کا وقت پر استعمال کرنا مراد و ہدف تک پہنچنا ہے۔

بچو! دنیا کا سارا نظام وقت کا پابند ہے۔ چاند، سورج اور ستارے کے اوقات بھی مقرر ہیں۔ یہ سبھی وقتِ مقررہ پر نکلتے اور ڈوبتے ہیں۔ اگر ہم کامیاب لوگوں کی زندگی کو دیکھیں اور ان کے روزمرہ کے اوقات کا مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہ لوگ کس قدر اپنے وقت کا استعمال کرتے تھے اور اس تعلق سے کتنے فکرمند رہتے تھے۔

بچو! یہ اکیسویں صدی ہے۔ اس صدی کو ٹکنالوجی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ وقت کو برباد اور ضائع کرنے والی بہت سی چیزیں ہمارے اردگرد ہیں۔ موبائل، لیپ ٹاپ، ٹیلی ویژن، ویڈیو گیمز وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے استعمال میں ہم محتاط نہیں رہتے اور اپنے قیمتی اوقات ضائع کر دیتے ہیں۔ جب کہ یہ پڑھنے، نئی نئی چیزیں سیکھنے اور کیریئر بنانے کی عمر ہے۔ الیکٹرانک آلات کا ضرورت کے بقدر ہی استعمال کرنا مفید اور کارآمد ہے۔ آپ سبھی درسی اور غیر درسی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ دوسری موضوعات کی کتابوں کو بھی والدین اور اساتذہ کی مدد سے اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں۔ اس عمر میں آپ جتنا وقت مفید اور کارآمد کتابوں کے مطالعے میں صرف کریں گے، مستقبل آپ کا اتنا ہی تابناک اور روشن ہوگا۔

پیارے بچو! مارچ 2025 کے شمارے میں وقت کی اہمیت پر ایک کہانی دی جا رہی ہے جس میں وقت کے حوالے سے بہت اہم باتیں بتائی گئی ہیں۔ اس کہانی کو آپ پڑھیں گے تو وقت کی قدر و قیمت کو اچھے طریقے سے سمجھ پائیں گے۔ مارچ کے مہینے میں ہولی کا رنگارنگ تہوار ملک بھر میں منایا جاتا ہے۔ اس مناسبت سے بھی ایک نظم دی جا رہی ہے۔ ہولی کا تہوار ہمیں کیا پیغام دیتا ہے اس نظم کو پڑھ کر آپ بخوبی جان جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف موضوعات پر کئی نظمیں اور کہانیاں شامل ہیں، آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے ہر ماہ بیس سوالات مع جوابات دیے جاتے ہیں اسے آپ یاد بھی کریں اور نوٹ بک میں محفوظ بھی کر لیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو آپ کو مستقبل میں کام آئیں گے۔

آپ کا

شمس اقبال

ڈاک خانہ

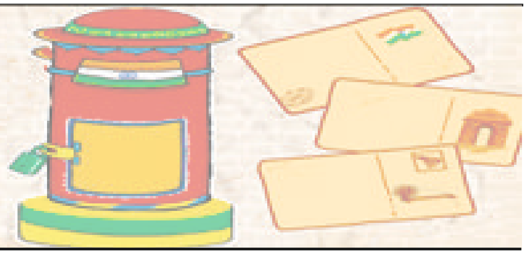

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' فروری 2025 ملا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کی ایک خوبی یہ ہے کہ وقت پر موصول ہوتا ہے۔ اس کے مشمولات میں تنوع ہوتا ہے، اس لیے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی اس کو پڑھتے ہیں اور ہر فرد کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور وجہ مسرت بنتا ہے۔ جیسے قانون کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے رسالے کا پہلا مضمون 'بہادر فوجی اور ہمارے بچے' بہت عمدہ ہے جسے خواجہ عبدالمنتقم نے لکھا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے اپنے ملک کی حفاظت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس میں بہادری کی مثالوں سے مضمون کو وقیع بنایا گیا ہے۔

دوسرا مضمون بھی ہندوستان کے سیاق میں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار سید واجد علی شاہ جیلانی ہیں۔ انھوں نے 'بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین' کے عنوان سے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صلاحیت، علم وادب سے دلچسپی اور ان کی معاملہ فہمی کو بیان کیا ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ تیسرا مضمون بھی ملک بھارت ہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس کا عنوان 'بچوں کے ڈاک ٹکٹ کی کہانی' ہے جو بال دِوس 19 نومبر 1976 کے ایک خاص ٹکٹ کو دکھایا گیا ہے۔ اس 25 پیسے کے ٹکٹ پر ایک پالنا ہے جس میں ایک بچہ لیٹا ہوا ہے۔ بعدازاں ایک نظم ہے جسے محمد وکیل نے لکھا ہے۔ عنوان 'مجھ کو سائنس داں تو بنا دو' ہے۔ اس نظم میں ایک بچہ سائنس داں بننے کی خواہش کرتا ہے۔ اگلا مضمون اکبر خاں اشک جالوری کا ہے۔ 'بیا چڑیا کا گھونسلہ' اس میں مضمون نگار نے بیا کے گھونسلے کو بیان کیا ہے کہ وہ اتنا خوبصورت گھونسلہ کیسے بناتی ہے جو موسم اور خطرناک جانوروں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کے بعد سائنس سے متعلق 'روشنی' عنوان سے مضمون ہے۔ سید شہاب الدین کا مضمون 'کیلشیم اور میگنیشیم' ہے۔ انسانی جسم میں موسم کے مطابق حسب ضرورت غذا کی کیا اہمیت ہے۔ اگر ضروری اشیا و خوراک نہ استعمال کی گئی ہوں تو اس کے نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی بہت عمدہ ہیں جو ذہن ودل کو طمانیت پہنچاتے ہیں۔

رانیہ خان، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'بچوں کی دنیا' مارچ کا شمارہ ملا، سرورق پر سائنس سے متعلق تصویر دیکھ کر اچھا لگا، بچوں کو کتابوں سے جوڑنے اور جوڑے رکھنے کے لیے اس طرح کی چیزیں بے حد ضروری ہیں، اداریے میں بھی سائنس پر گفتگو کی گئی ہے اور سائنس کی اہمیت و افادیت سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کی تحریریں وقت کی ضرورت ہے، ڈاک خانے کے تحت تین خطوط موجود ہیں کسی بھی میگزین

قارئین

کے لیے خطوط اور قارئین کی آرا کی بڑی اہمیت ہے وہ بتاتے ہیں کہ میگزین کیسی ہے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کیا کیا اقدام کیے جا سکتے ہیں۔ مضامین، سائنس، نظمیں، کہانیاں، صحت اور واقفیت عامہ کے تحت بچوں کی نفسیات اور ان کی سمجھ کو مدنظر رکھتے ہوئے تحریریں منتخب کی جاتی ہیں۔ تین بے حد معلوماتی مضامین 'بہادر فوجی اور ہمارے بچے'، 'بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین' اور 'بچوں کے ڈاک ٹکٹ کی کہانی' ہیں جسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا، خاص طور پر بچوں کے ڈاک ٹکٹ کی کہانی بہت شاندار ہے، اس میں مختصر طور پر ڈاک ٹکٹ کی تاریخ اور اس کی نوعیت پر بات کی گئی ہے، میں اس شاندار تحریر کے لیے سلطان احمد ساحل صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔ سائنسی مضامین کے تحت کیلشیم اور میگنیشیم اور روشنی تحریر بھی پسند آئی، سائنسی مضامین کو زیادہ سے زیادہ جگہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ بچوں کی دلچسپی اس رسالے کے لیے برقرار رہے۔ صحت کے تحت موسمی پھل بھی معلوماتی مضمون ہے اور کس موسم میں کون سا پھل کھانا چاہیے اس کا ذکر بڑی عمدگی اور صفائی سے کیا گیا ہے۔ واقفیت عامہ میرے لیے سب سے کارآمد چیز ہے جس کا میں ہر ماہ انتظار کرتی ہوں اور اپنی ڈائری میں سوالات اور جوابات نوٹ کرتی رہتی ہوں تا کہ مستقبل کے امتحانات میں یہ میرے کام آئے۔ مجموعی طور پر یہ بچوں کی دنیا دیگر رسائل کے مقابلے میں عمدہ اور معیاری رسالہ ہے اور میں مدیر محترم شمس اقبال صاحب سے درخواست کروں گی کہ اس رسالے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوششیں کرتے رہیں۔

عریشہ ناز، بیتا، دربھنگہ، بہار

گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول باندی پورہ کشمیر

مواصلاتی نظام کی انقلابی تبدیلی کے ساتھ مستقبل کی عمدہ تصویر پیش کرتے ہوئے سرورق پر مشتمل ماہ فروری 2025 کا شمارہ موصول ہوا۔ 'بہادر فوجی اور ہمارے بچے' عمدہ مضمون ہے۔ سید واجد علی شاہ صاحب نے 'بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین' پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ 'بچوں کے ڈاک ٹکٹ کی کہانی' بھی اچھا مضمون ہے۔ سائنسی مضامین 'مجھ کو سائنس داں تو بنا دے'، 'بیا چڑیا کا گھونسلا'، اور 'روشنی' اچھے مضامین ہیں۔ نظمیں یاد ہے، مور، موبائل، مانیٹر، موسم بہت خوب ہے۔ کہانیوں میں ٹفن باکس، محبت کی دولت، دریا دلی، تحفہ، حقیقی خوشی، معصوم ہاتھ دلچسپ ہیں۔ قسط وار ناول 'جنگل کی کہانی' اور صحت پر مشتمل 'موسمی پھل' بھی عمدہ تحریریں ہے۔ سلیم خان نے اپنی کہانی محبت کی دولت بہت عمدہ ہے۔ اس کہانی میں موصوف نے انسانی جذبات، محبت اور آپسی ہمدردی پر بہت مفید باتیں تحریر کی ہیں۔ ایک نوجوان کامیاب ڈاکٹر بننے کے بعد بھی اپنے رکشا والے انکل کے احسانات کو یاد رکھتے ہوئے ان کی بڑھاپے میں مدد کرتا ہے۔ اس کہانی کی اشاعت کے لیے ادارہ لائق ستائش ہے۔

اسمعیل سلیمان، کرہاڈ خورد تحصیل پاچورہ ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

مضمون

رئیس صدیقی

روزہ کشائی

ماہِ رمضان میرا اکثر لکھنؤ میں گزرتا اور اپنا بچپن یاد آنے لگتا۔ آنکھوں کے سامنے سے یادوں کا معصوم اور ست رنگی کارواں گزرنے لگتا ہے۔ ایسے موقعے پر آپ سے اپنے بچپن کی باتیں کرنے کا دل چاہتا ہے کیونکہ ہر شخص کا بچپن، اس کی زندگی کا پیاری پیاری باتوں سے بھرا انمول یادوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔

اس وقت میری عمر تقریباً آٹھ یا نو سال کی ہوگی۔ شدت سے گرمی پڑ رہی تھی۔

میں روزانہ صبح سحری میں اٹھ جاتا۔ یا یوں کہیں کہ دودھ، پھینی اور دیسی گھی میں تلے آلو کے پراٹھوں کی خوشبو مجھے اٹھا دیتی تھی۔

اس کے علاوہ، ان دنوں سحری کے وقت، روزانہ اللہ کے کچھ نیک بندے اپنی پُر ترنم آواز میں روزے داروں کو اٹھانے کے لیے سحری نعرہ لگاتے کہ:

جاگو سونے والو۔ غفلت کی نیند سے اٹھو۔ سحری کا وقت ہو گیا ہے۔ شیطان بہکائے گا۔ اس کے بہکاوے میں مت آنا۔ یہ مبارک مہینہ ہے، دوبارہ نصیب ہو نہ ہو۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، جیسی نصیحت آمیز باتیں کر کے وہ جگانے کی بھرپور کوشش کرتے۔

وہ لوگ ڈفلی بجانے کا اپنا ہنر دکھاتے۔ عقیدت بھری آواز میں سحری نغمے گاتے۔ منقبت، نعت اور حمد پیش کرتے۔ گویا کہ وہ لوگ سحری کے لیے اٹھا کر ہی دم لیتے۔

میں روزانہ سحری کر کے جلدی سے سونے کی کوشش کرتا لیکن امی اپنے ساتھ نماز پڑھواتیں اور تب جا کر سونے کی اجازت ملتی۔

ان دنوں روز شام کو مسجد میں افطاری پہنچانے کا عام رواج تھا۔ یہ میری ڈیوٹی تھی کہ میں روز مسجد میں افطاری پہنچاؤں۔ میں وہیں رک کر روزہ کھولتا، افطار کرتا اور

مغرب کی نماز ادا کرتا۔

ایک دن امی نے کہا کہ جب تم روز سحری کرتے ہو۔ روزہ کھولتے ہو، افطار کرتے ہو، نماز پڑھتے ہو، تو تم روزہ بھی رکھ لیا کرو۔

چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن اکثر والدین اپنے بچوں کو کم عمری میں روزہ رکھنے کے لیے اصرار نہیں کرتے ہیں، خاص طور سے گرمی میں۔ اس لیے مجھے بھی اپنے والدین کی رضامندی درکار تھی۔

بہرحال، روزہ کشائی کے لیے چودھواں روزہ مقرر ہوا۔ سحری میں میری پسند کی چیزیں بنائی گئیں۔ اس سحری میں کچھ زیادہ ہی چیزیں تھیں۔ خاص طور پر کئی طرح کے شربت تھے۔

سہ پہر سے ہی افطاری اور کھانا پکانے کا اہتمام ہونے لگا۔ رشتے داروں اور محلے کے بہت سے لوگوں کو افطار کی دعوت دی گئی۔ رشتے داروں کو عشائیہ یعنی ڈنر کی بھی دعوت تھی۔ دعوت دینے کی ذمے داری میں مجھے بھی لگایا گیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، پیاس اور بھوک شدت اختیار کر رہی تھی۔

امی یہ سب کچھ محسوس کر رہی تھیں۔ لہٰذہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مجھے اپنے پاس بُلا تیں اور روزہ رکھنے کی فضیلت بیان کرتیں۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا، بہت سے غریب لوگ بھوک اور پیاس سے بیمار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مر جاتے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔

پھر ماہِ رمضان کی اہمیت بتانے لگتیں:

بیٹا، یہ مہینہ ہمیں ٹریننگ دیتا ہے کہ ہم اپنی بھوک، پیاس، غصہ، لالچ، غیبت، وقت کی بربادی اور تمام برائیوں پر کیسے قابو پائیں تاکہ ہم آئندہ آنے والوں دنوں میں ایک اچھے انسان کی طرح اپنے گھر، اپنے سماج اور اپنے ملک کا بھلا کر سکیں۔

بہرحال، شام کے چھ بج گئے۔ مجھے تیار ہونے کے لیے کہا گیا۔

مجھے گرمی کے لحاظ سے سوتی کپڑے کی کریم رنگ کی شیروانی پہنائی گئی۔ امی نے میرے لباس پر بہت اچھا سا عطر لگایا۔ والد صاحب کی منھ بولی بہن، میری پھوپی جان نے پھولوں کا ہار پہنایا۔ اس طرح مجھے کسی دولہے راجہ کی طرح خوب تیار کیا گیا۔

رشتے داروں میں کچھ لوگ پھل، تو کچھ لوگ خشک میوہ اور دیگر کھانے کی چیزیں سینی یعنی بڑی سی تھال میں سجا کر، سنہرے اور روپہلے گوٹے لگے کنارے والی سرخ ریشمی خوان سے ڈھک کر لائے تھے۔ اِسی کے ساتھ مبارکباد اور دعائیں دینے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ افطاری میں کھجور، تخم ملنگا کا شربت (چھوٹے چھوٹے سفید دانے کے برابر پھول والا شربت)، فالسہ کا شربت، روح افزا، شکنجی، نمکین لسی، پیاز کے پکوڑے، بیسن میں تلی ہوئی مرچ، کابلی چنے، دہی بڑے، آلو کے قتلے، پاپڑ، نمک پارے، تربوز، خربوزہ، سنگترے، ناشپاتی، ببوگوشہ اور آم کی قاشیں، کیلے کے قتلے، سبز اور عنابی انگور وغیرہ، غرضیکہ انواع و اقسام کی نعمتیں دسترخوان کی زینت بنی ہوئی تھیں اور انھیں دیکھ دیکھ کر میرے منھ میں پانی آ رہا تھا۔

ابو جان نے میری حالتِ غیر کو بغور دیکھا اور فرمایا۔ بیٹا، یہ وقت اپنے نفس، اپنی بھوک پیاس اور اپنے اوپر قابو پانے کی تربیت کا ہے۔ اس وقت اللہ سے دعا کرو کہ وہ ہمارا روزہ قبول فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم پورے مہینے روزہ رکھ سکیں۔ پھر ہم سبھی لوگ دعا کرنے لگے کہ اتنے میں ایک گولہ دغہ جو کہ روزہ کھولنے کے وقت کا اشارہ تھا اور پھر مسجد سے اذان کی آواز آئی۔

میں نے سب سے پہلے کھجور سے روزہ کھولا اور شربت روح افزا پیا۔ پیاس اور بھوک کو تھوڑی راحت ملی۔ پھر جلدی جلدی بیسن میں تلی پیاز کی پھلکیاں کھانے لگا۔

امی نے اشارہ کیا کہ میں آرام سے کھاؤں۔

افطاری کے بعد، گھر پر ہی نماز باجماعت پڑھی گئی۔ کچھ دیر دینی اور غیر دینی باتیں ہوئیں۔ پھر دسترخوان پر کھانا لگنے لگا۔ ڈنر میں بھی مزے مزے کے پکوان تھے۔ مجھے یخنی پلاؤ اور زردہ بہت پسند ہے۔ رومالی روٹی، شامی کباب، قورمہ، گوشت دو پیازہ وغیرہ کے ساتھ شیرمال بھی کھایا۔ شاہی ٹکڑے اور کھیر کا بھی مزہ لیا۔

پھر میری ڈیوٹی لگی کہ میں مسجد کے امام صاحب کو کھانا دے کر آؤں۔

اُن دنوں مسجد کے امام کو دوپہر اور رات کا کھانا پہنچانا محلّہ کے ہر گھر پر اخلاقی طور پر لازم تھا۔ ہر گھر کا دن اور وقت مقرر تھا۔

بہر حال، اس ماہ بقیہ پورے روزے رکھے۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن یہ مشاہدہ اور تجربہ بھی ہوا کہ اللہ جسے توفیق دے، وہی شخص روزہ رکھ سکتا ہے!!!

■

Rais Siddiqui
Bangalow No2, Rahat Kada
14 Green Valley Enclave
Airport Road
Bhopal- 462030 (MP)
Mob.: 9810141528
rais.siddiqui.ibs@gmail.com

عظیم اقبال

اشارے کی زبان اور اس کے فوائد

"**بچوں** کی تربیت کے دوران والدین کو ایک کوچ کی طرح برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ غیر محسوس طریقے سے انھیں بہتر انسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

-ایلین جونس، امریکی بزنس ویمن

ہمعصر دانشوران اس قول سے اتفاق کرتے ہیں کہ تجزیہ کار بھی اس کی صداقت پر سوال نہیں کرتے۔

تجربہ: گذشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے وسط میں نوجوانوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم Apex Club کی مقامی شاخ کے سربراہ کے بطور میں نے رفاہی کاموں کے لیے صرف کسی تجویز پر اکتفا نہ کرکے بذاتِ خود پیش قدمی کی تو دیگر اراکین بے حیل و حجت پیچھے چل پڑے اور نشانہ پورا ہوا۔ میرے اقدام سے ہم نواؤں کو جو تحریک ملی وہ بااثر اور بے مثال تھی۔ پذیرائی کی لڑی لگ گئی اور وابستہ نوجوانوں کی قوت کو ایک نئی سمت دینے کے لیے عمدہ کلمات سننے لگے۔

مشاہدہ: انھی دنوں ایک تعلیمی ادارے کے منتظم کے بطور میں نے خاکروب اٹھانے میں پہل کی تو پھر سارے بچے بھاگ، دوڑ کرتے صفائی میں لگ گئے، اور دیکھتے دیکھتے گرد و پیش سے گرد و غبار کا نام و نشان مٹا دیا۔ فرش ہی نہیں، در و دیوار تک میں چمک آ گئی۔ صفائی کا جو ماحول تھا، وہ روٹین کا حصہ بن گیا۔ ہفتے کو اس موقعے کا بے صبری سے انتظار رہتا اور جوش و ولولہ معرکے کا ہوتا، اور یہ ایک واقعہ بن جاتا۔

خلاصہ: مذکورہ دونوں صورتوں میں ہدایت سے دست کشی کی گئی اور کام کے لیے اشارے پر اکتفا کیا گیا، جس سے ایک ماحول بنا اور بنا کسی رکاوٹ کے کام وہاں تک پہنچا، جہاں کا ارادہ کیا گیا تھا۔ سچ کہیے تو کام وہاں تک گیا، جس کا اندازہ نہ تھا۔

ہدایت کے مضمرات: ہدایت کار دوسروں سے منسلک ہونے کے بجائے ان سے منقطع ہو جاتا ہے۔ ان کے درمیان واسطے مفقود ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ ہدایت ہوتی ہے وہ دیگر افراد کے لیے ہوتی ہے۔ ہدایت کار نظر میں ہوتا ہے نہ نظر کے باہر۔ مزید یہ کہ ہدایت میں تحکم نمایاں رہتا ہے۔ اس لیے لاشعوری طور پر یہ ہر کسی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ کسی نافرمانی یا احتجاج پر خاموشی کو ترجیح دینے کا مطلب یہ نہیں کہ عمل آوری حسب توقع ہوا اور نتیجہ حسب خواہش ہو۔ دورانِ عمل رخنہ کے

امکان نیز کسی بدمزگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے پیش نظر کام کے دورانیے کے طویل ہونے اور کام کے حسب منشا نہ ہونے کے خدشات بھی ہوتے ہیں۔

اشارے کے اندراجات: اشارے کی زبان فرمان سے مختلف ہوتی ہے۔ اشارے کا لہجہ دل پسند اور راغب کرنے والا ہوتا ہے۔ اس سے کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے، اس لیے پہلی پیشی میں ہی اسے دل سے قبول کرلیا جاتا ہے، اور کام کے لیے راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔ دوسری سوچ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کام میں تیز رفتاری کے لیے اضافی وقت درکار نہیں ہوتا۔ پھر، نتیجہ امیدافزا ہی نہیں، امید سے زیادہ ہوتا ہے۔ کام کے اختتام پر شادمانی عام ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اشارے میں خیرسگالی پنہاں ہوتی ہے۔ یہ رنگ لائے بنا نہیں رہتی۔ رنگ بھی ایسا جو اتنا سہانا ہو کہ آنکھ سے اترنے کا نام نہ لے۔

درسگاہ اوّل: شکم مادر سے لے کر آغوشِ مادر تک بچے کی پہلی درس گاہ سے عبارت ہے، جہاں ماں کی ذات کے علاوہ اس کے ذریعے دی گئی تعلیم و تربیت بچے کی کردار سازی میں معاون ہوتی ہے۔ اگر ماں جملہ خوبیوں سے متصف ہے تو بچے پر بھی اس کا عکس پڑنا ناگزیر ہے۔

بچے کے لیے ماں کی شفقت ضروری ہے، لیکن اس کی حدیں بھی ہیں۔ ان کے متجاوز ہونے سے زیادہ بگاڑ کا خدشہ ہے۔ پھر ماں کو حکم سے زیادہ حکمت میں دست گاہی ضروری ہے۔ ذرا سی غفلت، بچے کے لیے مضر ہوگی۔ دانائی کا تقاضا ہے کہ بچہ اشارے کی زبان سمجھے اور خاموشی کے رموز سے واقف ہو، شور، شرابے سے احتراز کرے اور بے جا ضد سے باز رہے۔ یہی بچہ جب سیانا ہوگا تو میدانِ عمل میں وہ کرے گا، جو اس نے سیکھا ہے۔ اس کے کارہائے نمایاں پر صرف اسے سراہنے کا سلسلہ نہ ٹوٹے گا، بلکہ اس کی ماں کو بھی، مبارک، سلامت، کی صدائیں ملیں گی، وہ ماں جس نے اس کی پروقار تربیت کرکے اپنا فرض بخوبی نبھایا۔

درسگاہِ ثانی: خاندانی رابطوں، تعلیمی واسطوں اور سماجی ضابطوں کا مرتبہ فرد کی درسگاہِ ثانی کا ہوتا ہے، جہاں اس کی سوچ وفکر کو پختگی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کے تجربوں کے بموجب ہی کارزارِ حیات میں اس کی پیش قدمی ہوتی ہے۔ اس تمام دورانیے میں اس کی تربیت جاری رہتی ہے۔ بعدازاں اس کا ہر ردعمل اس کا محض عکس ہوتا ہے۔ یہاں کوئی اس کا رہنما نہیں ہوتا ہے، لیکن اس موقعے پر اس کی نگاہ اور اس کے ذہن کی چستی، درستی کام آتی ہے۔

دیگر عوامل: مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے فرد کی فکر میں انتہائی درجے کی تبدیلی آتی ہے۔ اس سے اس کے کردار کو جلا ملتی ہے۔ عمدگی، خیرخواہی اور فلاح کی جانب وہ بڑھتا ہے۔ اب وہ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع کے لیے خود کو وقف کردیتا ہے۔

عزیز دوستو! ہدایت سے دست بردار ہونے اور اشارے سمجھنے اور سمجھانے کی طرف مائل ہوں، کیونکہ یہ نتیجہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ ثمر بار ہونے کی ضمانت بھی ہے!

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj -1
Bettiah - 845439 (Bihar)
Mob.: 9006502649

مسعودہ حیات

ہولی

گلی گلی بازار میں ہو گئی رنگوں کی بوچھار
آنچل بھیگے تن من بھیگا گال ہوئے گلنار
کتنی امنگیں لے کر آیا ہولی کا تیوہار
آیا ہولی کا تیوہار لے کے رنگوں کی بہار
منظر ہوئے رنگیلے

رنگوں سے غبارے بھر کر بچے چڑھے اٹاری
سبزہ سبزہ رنگ میں ڈوبا بھیگی ڈاری ڈاری
کوئی نہ بچنے پایا ان سے پنڈت ہو کہ پجاری
آیا ہولی کا تیوہار لے کے رنگوں کی بہار
منظر ہوئے رنگیلے

ڈھول بجائیں گائیں نوکر ہوں کہ وہ بیوپاری
ڈھولک کی ہر تھاپ پہ ناچیں ہولی میں نرناری
کھیلیں کودیں دھوم مچائیں اور ماری پچکاری
آیا ہولی کا تیوہار لے کے رنگوں کی بہار
منظر ہوئے رنگیلے

ہندو مسلم سکھ عیسائی مل کر کھیلیں ہولی
آج کے دن سب بھید مٹا کر بولیں میٹھی بولی
سب نے ہولی کے رنگوں سے دل کی کالک دھولی
آیا ہولی کا تیوہار لے کے رنگوں کی بہار
منظر ہوئے رنگیلے

■

ماخذ: تصویر وطن بحوالہ ریختہ ڈاٹ او آر جی

عزیز انصاری

بچوں کے لیے گیت

کیلے والے بابا

بچہ : کیلے والے کیلے والے بابا کیلے دے نا۔ بابا کیلے دے نا

بابا : بھولے بھالے، پیارے پیارے، بچے پیسے دے نا۔ بچے پیسے دے نا

بابا : کھیت میں کتنی محنت کر کے میں نے اگائے کیلے
جیب میں تیری پیسے ہوں تو سارے کیلے لے لے

بچہ : کیلے والے کیلے والے بابا کیلے دے نا۔ بابا کیلے دے نا

بچہ : ممی پاپا دفتر میں ہیں، گھر پہ لگا ہے تالا
بھوک لگی ہے کوئی نہیں ہے کھانا دینے والا
کیلے والے، کیلے والے بابا کیلے دے نا۔ بابا...

بابا : پہلے تم دو کام کرو تو، میں کیلے دے دوں گا۔ میں کیلے دے دوں گا
ان کیلوں کے بدلے تم سے پیسے بھی نہ لوں گا۔ پیسے بھی نہ لوں گا

بابا : یہ کیلے اس بھوکی بوڑھی اماں کو دے آؤ۔ اماں کو دے آؤ
یہ پودا لو اس پودے کو آنگن میں بو آؤ۔ آنگن میں لگاؤ
بھولے بھالے پیارے پیارے...

بچہ : کام تمھارا کر آیا میں اپنا وعدہ نبھاؤ۔ اپنا وعدہ نبھاؤ

بابا : آؤ آؤ میٹھے کیلے جی بھر کھاؤ۔ کیلے جی بھر کھاؤ
کیلے جی بھر کھاؤ۔ کیلے جی بھر کھاؤ

بچہ : کیلے والے کیلے والے بابا کیلے دے نا۔ بابا کیلے دے نا

بابا : کیلے جی بھر کھاؤ۔ کیلے جی بھر کھاؤ

■

Aziz Ansari
14/1, Usha Ganj (Khan Bahadur Compound)
Indore - 452001 (MP)
Mob.: 9329333156, azeezansari62@gmail.com

نظم

رحیم رضا

بٹیا پیاری

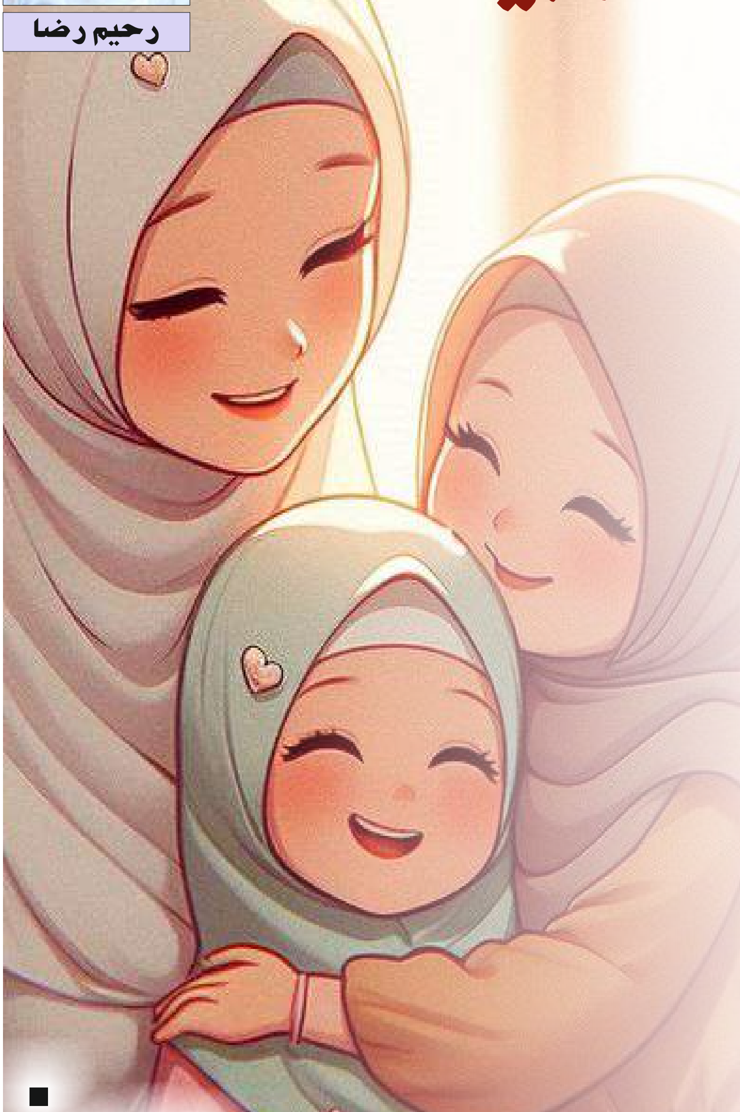

ایک تھی شنو بٹیا پیاری
سارے گھر کی راج دلاری
نہ دن دیکھے اور نہ راتیں
کرتی بس پریوں کی باتیں
ایک دن وہ امی سے بولی
امی میری پیاری امی
آؤ پاس ذرا بیٹھو تم
امی میرا خواب سنو تم
میرے پاس پری آئی تھی
میرے لیے تحفہ لائی تھی
ننھی ایسا کب ہوتا ہے
خواب کہیں سچا ہوتا ہے
ایسا ہے تو مجھے سناؤ
کیا تحفہ ہے مجھے بتاؤ
امی آنکھیں بند کرو تم
میں جو بولوں وہی کرو تم
مجبوری ہے دل میں بولیں
امی نے جب آنکھیں کھولیں
شنو کاپی لیے کھڑی تھی
پری کی ایک تصویر بنی تھی
ہاتھ میں دیکھا اک تحفہ تھا
اس پر شنو نام لکھا تھا

■

Raheem Raza
Raza Manzil, 2587, Khirni Pura
Yawal- 425301
Distt.: Jalgaon (Maharashtra)
Mob.: 9890007154
raheemraza963@gmail.com

بچے گلشن کے پھول

انور آفاقی

اے مرے بچو! مرے گلشن کے پھول
تم پہ نا چھائے کبھی نفرت کی دھول
پیار چھوٹوں سے، بڑوں کا احترام
زندگی بھر یاد رکھنا یہ اصول
گر ارادہ نیک ہو محنت بھی ہو
ہو نہیں سکتا کوئی بچہ ملول
دل لگاکر خوب محنت سے پڑھو
کھیلو کودو وقت نہ گزرے فضول
اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہو
راستے میں سنگ آئے یا ببول
دوستی کرنا کتابوں سے بہت
دُھن کے پکّے طلبا کا ہے یہ اصول
رب سے کر توبہ ہمیشہ بار بار
ہیں یہی فرماتے اللہ کے رسولؐ
خلق کی خدمت بھی کرنا ساتھ ساتھ
بات انور کی کبھی جانا نہ بھول

■

Anwar Afaqi
Hoda Manzil
Rajtoli Bhigo, P.O: Lalbagh
Darbhanga - 846004 (Bihar)
Mob.: 9931016273
ahsanalam16@yahoo.com

پہاڑی کے دامن میں...

عطاء الرحمن طارق

پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا گھر
نہ چِنتا، نہ کھڑکا، نہ خطرہ، نہ ڈر

فراغت سے چرتے ہیں میدان میں
مویشی اٹھاتے نہیں اپنا سر

ڈھلانوں میں ہیں کھیت لیٹے ہوئے
بلندی سے دیکھو ذرا جھانک کر

'ترل رل' بہے جارہی ہے ندی
مگر اپنی منزل سے ہے بے خبر

ہوئی شام کہرا اترنے لگا
کیا ختم سورج نے اپنا سفر

پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا گھر
بلاتا ہے- کب آؤ گے تم، اِدھر؟

■

Ataur Rahman Tariq
Vijaya Co-op. Hsg. Society
Vaishali Nagar
K.K Road, Mahalaxmi
Mumbai - 400011 (Maharashtra)
Mob.: 9773238043
ataurrahmankamil@yahoo.com

نظم

تبسم سحر

چلو ہم پڑھیں...

چلو ہم پڑھیں مل کے 'بچوں کی دنیا'
مضامین کی، صحت کی، نظموں کی دنیا
دنوں کی، مہینوں کی، برسوں کی دنیا
ہے حرفوں کی، لفظوں کی، جملوں کی دنیا
مزہ سیر کرنے میں آتا ہے، اس کی
ہے تاروں کی، نغموں کی، پھولوں کی دنیا
خوشی سے اچھل پڑتے ہیں، نام سن کر
یہ 'بچوں کی دنیا' ہے تحفوں کی دنیا
نئی نسل کو ہے تجسس کہ کیا ہے
امیروں کی دنیا، غریبوں کی دنیا
کسی نے کہاں ان کو آنکھوں سے دیکھا
بیاباں کی، پریوں کی، بونوں کی دنیا
پڑھیں شوق سے سب اسے کیوں کہ یہ ہے
جوانوں کی، بوڑھوں کی، بچوں کی دنیا
کتب خانے جاؤ، خریدو کہیں سے
یہ خوابوں کی، سوچوں کی، اچھوں کی دنیا
خریدار بن کر، پڑھے شوق سے وہ
سحر کو پسند آئے، بچوں کی دنیا

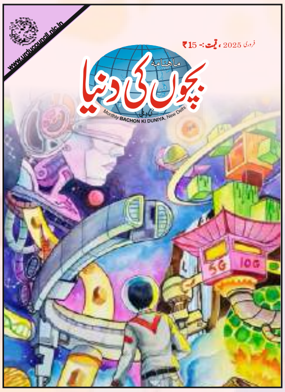

Tabassum Sahar
Novel Heights, Flat No: 12
Near Delta Royal
Satvik Nagar, Pakhal Road
Nashik - 422011 (Maharashtra)
Mob.: 8888315125
tabassumsaher16@gmail.com

کوا

وسیم احمد نگرامی

وہیں پہ بیٹھا ہے وہ آ کر
کوڑے کا ہو جہاں پہ جھوا
کاؤں کاؤں کی ٹیر لگانے
روز چلا آتا ہے کوا
دادا کہتے اسے نہ ڈانٹو
کچھ نقصان نہ کرتا ہے یہ
گلی سڑی یہ چیزیں کھاتا
صاف صفائی کرتا ہے یہ
ڈرنے کی بھی بات نہیں ہے
اسے سمجھ کر کوئی ہوا
کاؤں کاؤں کی ٹیر لگانے
روز چلا آتا ہے کوا
اس کو اپنا دوست ہی سمجھو
کام سبھی کے آتا ہے یہ
نہیں مانگتا میوا مصری
سوکھی روٹی کھاتا ہے یہ

منا اس کو دیکھ بناتا
اس کے جیسا چیل بلاوا
کاؤں کاؤں کی ٹیر لگانے
روز چلا آتا ہے کوا
آنے کو مہمان جو ہوتے
سب سے پہلے یہی بتاتا
آ کر چھت کے اوپر بیٹھے
کاؤں کاؤں کرنے لگ جاتا
بھر جاتا ہے پیٹ ذرا میں
نہ ہی چھٹاک نہ کھاتا پوّا
کاؤں کاؤں کی ٹیر لگانے
روز چلا آتا ہے کوا

■

Waseem Ahmad Nigrami
R N J Inter College Nagram
Lucknow-226303 (UP)
vasimahmad438@gmail.com
Mob.: 9198931894

نظم

محمد توقیر عالم نظمی

علم

نہیں علم سے کوئی بڑھ کر ہے دولت
مرے پیارے بچو! بڑی اس کی عظمت
کتابوں میں اس کی بڑی ہے فضیلت
کیا جس نے حاصل بڑھی اس کی عزت
اگر سیکھ لے علم و فن کوئی بچہ
بڑے بوڑھے کرتے ہیں اس سے محبت
محبت جو بچہ رکھے علم و فن سے
صلے میں یقیناً ملے اس کو جنت
ہے رتبہ بڑا علم و دانش کا رتبہ
زمانہ کرے ہے بڑی اس کی چاہت
نہ حاصل کرے علم گر کوئی بچہ
اٹھائے زمانے میں ہرجا وہ ذلت
جو بچہ ہے مفلس کرے علم حاصل
ملے گی اسی کو حقیقت میں راحت
نہ آنکھیں کبھی علم سے تم چرانا
اگرچہ کوئی دے تجھے مال و دولت
مرے پیارے بچو! کرو علم حاصل
ملے چین میں بھی اگرچہ یہ دولت
رہو سرخرو دین و دنیا میں تم سب
یہ نظمی کی خواہش، یہ نظمی کی چاہت
■

Md. Tauqeer Alam Nazmi
Shama Ideal Library
At & Po: Belad-e-Aadam
Distt.: Vaishali - 843114 (Bihar)
Mob.: 9771759436
tauqeeralam846105@gmail.com

نظم

فہیم احمد

ابو جی کی جیب

ابو جی کی جیب نرالی
کبھی نہیں رہتی ہے خالی
سکے اس میں کھن کھن کرتے
اور نوٹ بھی ساتھ اسی کے
ابو جی کی جیب بڑی ہے
ہر مشکل میں ساتھ کھڑی ہے
جیب خرچ ہم کو دلواتی
ساری خوشیوں سے ملواتی
سبزی والا، گوالہ، دھوبی
دیتی پیسے، آئے جو بھی
برفی، لڈو اور امرتی
اپنی خواہش پوری کرتی
پکنک پر ہم کو لے جاتی
امی کو شاپنگ کرواتی
کرتے یہی دعائیں بس ہم
پیسے کبھی نہ ہوں اس میں کم

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst. Professor, Dept of Hindi
Mahatma Gandhi Memorial (PG) College
Chaudhary Sarai
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.: 8896340824
drfaheem807@gmail.com

رخشاں ہاشمی

سب سے پیارا ہندوستان

دیکھو بچو! اس کی شان
ملک ہمارا بہت مہان

سب کی طاقت سب کی جان
دل میں بسا ہے ہندوستان

ہندوستان میں کثرت ہے
یہی ہماری وحدت ہے

عید، دیوالی، ہولی، راکھی
درگا پوجا اور بیساکھی

ہر تہوار کا رنگ جدا ہے
کتنی پیاری اس کی ادا ہے

تاج محل پہچان ہے اس کی
جنتر منتر جان ہے اس کی

قطب مینار اور لال قلعہ بھی
ہوا محل کی الگ ہے خوبی

چار مینار کا کیا ہی کہنا
انڈیا گیٹ بھی دیکھ کے رہنا

تہواروں پر سب ملتے ہیں
ہر آنگن میں گل کھلتے ہیں

ملک انوکھا سب سے پیارا
یہ ہے سب کی آنکھ کا تارا

ہندوستان کی بات الگ ہے
رنگوں کی برسات الگ ہے

سب کا دل سب کا ارمان
سب سے پیارا ہندوستان

■

Rakhshan Hashmi
Rizvi Colony
Shah Zubair Road
Munger - 811201 (Bihar)
Mob.: 9304342562

نظم

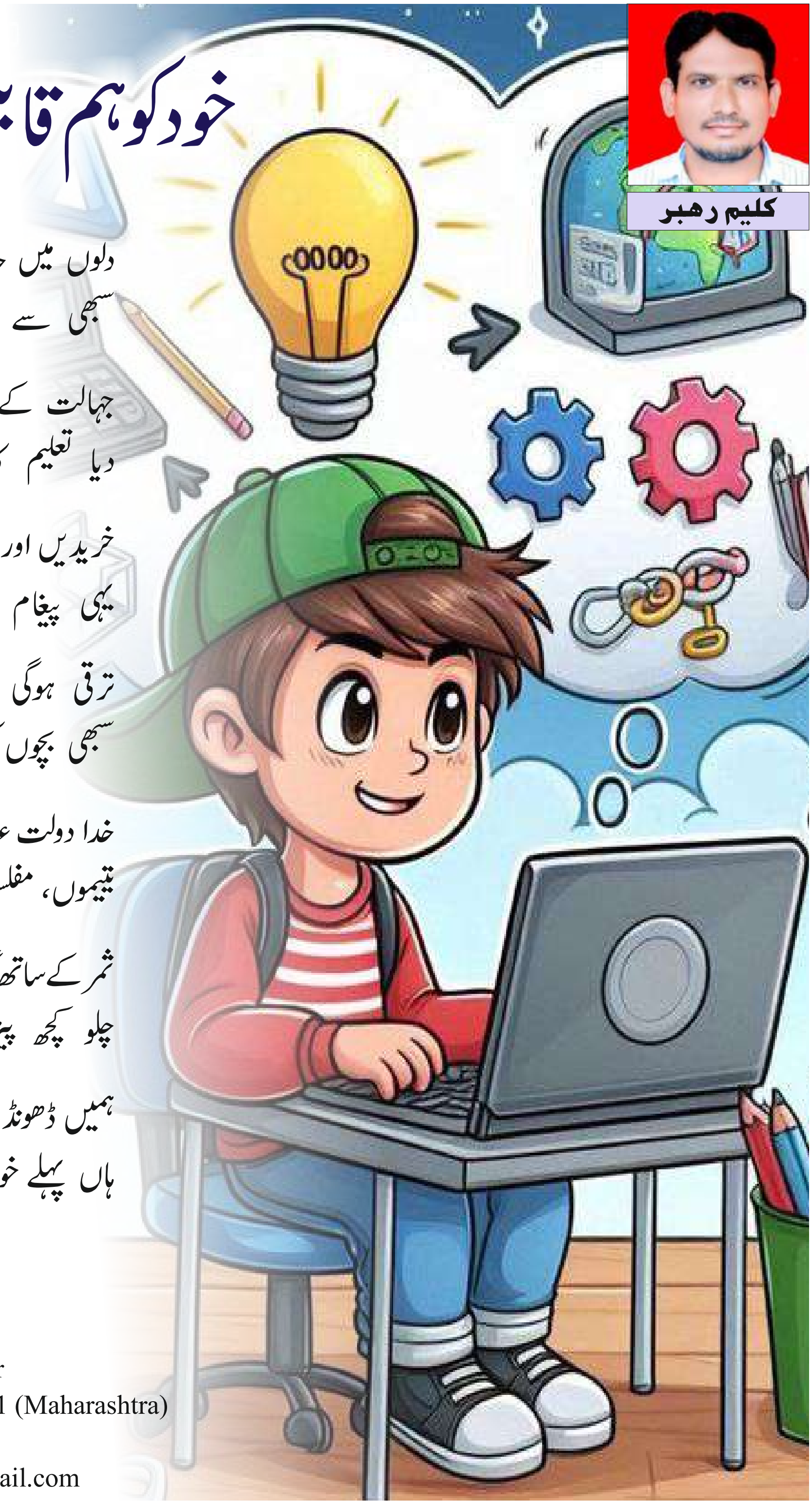

کلیم رہبر

خود کو ہم قابل بنائیں

دلوں میں جذبۂ خدمت جگائیں
سبھی سے رشتۂ الفت نبھائیں

جہالت کے اندھیروں کو مٹائیں
دیا تعلیم کا گھر گھر جلائیں

خریدیں اور پڑھیں 'بچوں کی دنیا'
یہی پیغام ہم سب کو سنائیں

ترقی ہوگی اردو کی جہاں میں
سبھی بچوں کو ہم اردو پڑھائیں

خدا دولت عطا کردے ہمیں جب
یتیموں، مفلسوں کے کام آئیں

ثمر کے ساتھ گہری چھاؤں بھی دیں
چلو کچھ پیڑ ایسے بھی لگائیں

ہمیں ڈھونڈے گی خود ہی کامیابی
ہاں پہلے خود کو ہم قابل بنائیں

■

Kaleem Rahbar
Chikhli Road, Amdapur
Distt.: Buldana - 444301 (Maharashtra)
Mob.: 9767125832
kaleemrahbar1976@gmail.com

اظہر افسر

مہاراجہ کے کپڑے

بچو، تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ برسوں پہلے ایک ایسا مہاراجہ بھی تھا جو اپنی ساری دولت اچھے اچھے کپڑے پہننے پر خرچ کرتا تھا نہ اسے اپنے سپاہیوں کی فکر تھی نہ وہ خود کبھی تفریح کے لیے کسی تھیٹر کو جاتا تھا۔ نہ شاہی سواروں میں بیٹھ کر کبھی باہر نکلتا تھا، کبھی کبھی باہر نکلتا بھی تو بس اپنے نئے کپڑے دکھانے کے لیے۔

دن میں ہر گھنٹہ بعد وہ اپنے کپڑے بدلتا تھا، جس طرح پرانے راجاؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ راجہ سارا وقت دربار میں صرف کرتے تھے۔ اس مہاراجہ کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مہاراجہ دن رات اپنے سنگھار کے کمرے میں رہتا تھا۔

مہاراجہ جس شاندار شہر میں رہتا تھا، اس شہر کی زندگی بڑی رنگین تھی۔ روزانہ سیکڑوں اجنبی لوگ اس شہر کی سیر کے لیے آتے تھے۔ ایک دن آنے والوں میں شہر میں دو ٹھگ آ گئے۔ یہ دونوں آدمی بڑے دھوکے باز تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو ماہر جولاہے ظاہر کیا۔ کہنے لگے ہم ایسے کپڑے بُن سکتے ہیں جو نہ صرف عجیب وغریب ہوں گے بلکہ بے مثال ہوں گے۔ ان کے رنگ ان کے ڈیزائن نہ صرف انوکھے ہوں گے بلکہ یہ کپڑے ان لوگوں کو نظر بھی نہیں آ سکتے جو اپنے کام میں نالائق ہوں گے اور بے وقوف ہوں گے۔

ہوتے ہوتے جب یہ خبر مہاراجہ تک پہنچی تو وہ بولا، ہوں یہ لوگ ہیں جو میرے لیے عمدہ سے عمدہ کپڑے تیار کرسکیں گے۔ ایسے کپڑے جنھیں پہن کر میں ان لوگوں کو پکڑ سکوں گا جو اپنے اپنے عہدوں کے لائق نہیں ہیں اور پھر سارے بے وقوفوں میں سے ان لوگوں کو چن لوں گا جو نہایت سمجھدار رہیں پھر مہاراجہ نے حکم دیا۔ فوراً کپڑے تیار کروائے جائیں۔

پھر مہاراجہ نے ان دونوں ٹھگوں کو دربار میں طلب کر کے ایک بھاری رقم کپڑوں کی تیاری کے لیے دے دی اور حکم دیا فوراً کام شروع کیا جائے۔

دونوں ٹھگوں نے کپڑا بننے کی بڑی بڑی مشینیں لگائیں اور ایسا ظاہر کیا جیسے وہ ان مشینوں پر بیٹھ کر کپڑا تیار کر رہے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ مشینوں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر دونوں کپڑا بُن رہے تھے۔ دن میں بھی اور رات دیر گئے تک۔

ایک دن مہاراجہ نے سوچا کپڑا بننے کا کام شروع ہو چکا ہے، چل کر دیکھنا چاہیے کہ آخر کپڑا کیسا تیار ہو رہا ہے۔ کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ یہ کپڑا ان لوگوں کو بالکل نظر نہیں آتا جو اپنے عہدے کے لائق نہیں ہیں اور بے وقوف ہیں۔ اگر—— اگر مجھے نظر نہ آئے تو کیا ہوگا پھر اس نے سوچا یہ ٹھیک ہے اپنے آپ جانے کے بجائے کچھ دوسرے لوگوں کو بھیجنا چاہیے کہ وہ دیکھیں گے کہ کام کیسا چل رہا ہے۔

سارے شہر میں ان دنوں کپڑا بُننے والوں کا چرچا ہو رہا تھا جو مہاراجہ کے لیے نیا لباس تیار کرنے والے تھے اور دن رات کپڑا بُن رہے تھے۔ ہر شخص اس بات کے انتظار میں تھا کہ مہاراجہ کپڑے پہنیں اور شہر کے بے وقوفوں کی تعداد معلوم ہو جائے۔ ہر شخص اپنے پڑوسی کو بے وقوف سمجھتا تھا۔

مہاراجہ نے سوچا سب سے پہلے اپنے بوڑھے وزیر کو بھیجنا چاہیے۔ یہ بہت ایماندار ہے، وہ سچ سچ بتا دے گا کہ کپڑا کیسا ہے، کام کیسا چل رہا ہے۔ بے شک میرا بوڑھا وزیر بہت سمجھدار ہے۔ اس جیسا کام کرنا بہت مشکل ہے، کوئی نہیں کر سکتا یہ بات طے ہے۔

بس صاحب مہاراجہ کے حکم سے بوڑھا وزیر وہاں پہنچا جہاں دونوں کام کر رہے تھے اور دن رات کام کر رہے تھے۔ خالی مشینوں پر دن رات کپڑا بُنا جا رہا تھا۔

جب بوڑھا وزیر پہنچا تو اسے سوائے مشینوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا اپنے آپ سے بولا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں، مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

دونوں ٹھگوں نے بوڑھے وزیر سے درخواست کی کہ وہ مشینوں کے قریب آ کر کپڑا دیکھیں رنگوں اور ڈیزائن کی تعریف کریں، پھر ان دونوں نے خالی مشینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، آیئے آیئے، قریب آیئے۔

بوڑھا وزیر پریشان تھا، اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نظر آتا کیسے وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا، لیکن بوڑھے وزیر نے سوچا کیا میں سچ مچ بیوقوف ہوں، اپنے اس عہدے کے لائق نہیں ہوں اور اگر ایسا ہے تو یہ بات کسی اور پر ظاہر نہیں ہونی چاہیے۔ نہیں نہیں میں کسی سے نہیں کہوں گا کہ مجھے کپڑا نظر نہیں آیا۔

دونوں میں سے ایک نے کہا۔ وزیر صاحب آپ صحیح صحیح رائے دیتے ہوئے بالکل مت جھجکیے۔

بوڑھا وزیر بولا، واہ، واہ، واہ۔ کیا کپڑا ہے، بہت خوبصورت، لاجواب واہ، بوڑھے وزیر نے اپنی آنکھوں پر چشمہ لگایا، بولا ”خوب ڈیزائن بنا رہے ہیں آپ لوگ۔ رنگوں کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔“

پھر وزیر نے بہت قریب سے کپڑے کو دیکھا تاکہ اپنے مہاراجہ سے وہ کپڑے کی تفصیل بیان کر سکے۔ ہوا

بھی ایسا ہی۔ بوڑھے وزیر نے مہاراجہ سے کپڑے کے رنگوں کی بناوٹ اور ڈیزائن کی وہ تعریف کی کہ مہاراجہ باغ باغ ہو گیا۔

بوڑھے وزیر کی تعریف کی خبر جب دونوں ٹھگوں کو ملی تو انھوں نے فوراً اور روپے طلب کیے، ریشم مانگا، سنہری تار مانگے تاکہ بنائی کا کام تیزی سے جاری رہے، مگر یہ تو تم جانتے ہو کہ چاہے وہ ریشم ہو، یا سنہری تار، یا رقم سب چیزیں دونوں ٹھگوں کی جیبوں میں جا رہے تھے۔ بنائی کی مشینوں میں تو ایک دھاگا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی دونوں ٹھگ دن رات کپڑا بُن رہے تھے اور مہاراجہ کا نیا لباس تیار کر رہے تھے۔

مہاراجہ نے اور زیادہ اطمینان کرنے کے لیے اپنے بھروسے کے ایک اور آدمی کو بھیجا کہ وہ بھی جا کر اس تیار ہونے والے کپڑے کو دیکھے اور خبر لائے کہ مہاراجہ کا لباس کب تک تیار ہو جائے گا۔

اس آدمی کے ساتھ بھی وہی سب کچھ پیش آیا جو بوڑھے وزیر کے ساتھ ہوا تھا۔ اس آدمی نے بھی بار بار مشینوں کو دیکھا مگر وہاں کپڑا کیا، کچھ بھی نظر نہ آیا۔

دونوں ٹھگوں نے اس آدمی سے پوچھا ''کیوں صاحب کپڑا کیسا بُنا جا رہا ہے، ہے نا مہاراجہ کے لائق —'' پھر دونوں نے ہاتھوں کو اس طرح پھیلایا جیسے وہ اسے نفیس کپڑا دکھا رہے ہوں۔

مہاراجہ کے بھیجے ہوئے اس آدمی نے بھی سوچا کہ مجھے کپڑا نظر نہیں آتا۔ کیا میں بیوقوف ہوں۔ ہوسکتا ہے اپنے عہدے کے لائق نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہے بھی تو کسی اور کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔

یہ سوچ کر اس نے دونوں ٹھگوں سے بنے جانے والے کپڑے کی تعریف شروع کر دی۔ پھر مہاراجہ کے پاس پہنچ کر بولا۔

حضور کیا کاریگر ہیں وہ دونوں۔ واہ۔ خوب اور کیا کپڑا بُن رہے ہیں وہ لوگ۔ کیا اس کے رنگ ہیں۔ کیا ڈیزائن ہے ایسا عمدہ لباس تیار ہوگا کہ سب کے سب دنگ رہ جائیں گے۔

غرض سارے شہر میں اس انوکھے کپڑے کی تعریف ہو رہی تھی جسے دونوں ٹھگ بُن رہے تھے۔ مہاراجہ بھی کپڑے کی تعریف سن سن کر خود کپڑا دیکھنے کے لیے بیقرار ہو رہا تھا مگر کپڑا تھا کہ ابھی مشینوں پر تھا۔

آخر مہاراجہ نے ایک دن اپنے بھروسے کی ایک جماعت کے ساتھ کاریگروں کے پاس پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ اس جماعت کے دو آدمی پہلے بڑے ماہر جولاہے رہ چکے تھے۔ ان سب کو لے کر مہاراجہ دونوں کاریگروں کے پاس پہنچا۔

مہاراجہ نے دیکھا کہ دونوں آدمی بڑے توجہ سے مشینوں کی طرف جھکے ہوئے کام کر رہے ہیں مگر یہ کیا۔ مشینوں میں ذرا سا دھاگہ بھی نہیں ہے۔

”واہ لاجواب“ جماعت کے ان دو ماہر جلاہوں نے پکارا۔ حضور والا۔ ذرا دیکھیے تو کیا ڈیزائن ہے، کیا اس کپڑے کے رنگ ہیں واہ۔

مہاراجہ نے مشینوں کو غور سے دیکھا۔

پھر سوچا کیا بات ہے۔ یہ کیا تماشہ ہے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ کیا میں بیوقوف ہوں یا میں مہاراجہ ہونے کے لائق نہیں ہوں۔ یہ لوگ کیا کہیں گے پھر مہاراجہ نے بلند آواز سے کہا۔ بہت خوبصورت کپڑا ہے مجھے بے حد پسند ہے، مگر سچی بات یہ تھی کہ اسے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

مہاراجہ کے ساتھ آئے ہوئے سارے لوگوں نے بڑے غور سے مشینوں کی طرف دیکھا، انھیں وہی نظر آیا جو وہاں تھا۔ یعنی خالی مشین، مگر سب نے مہاراجہ کی ہاں میں ہاں ملائی، بولے حضور، واہ۔ واہ۔ بے شک کیا عمدہ کپڑا ہے۔ خوب، پھر بولے، حضورِ والا۔ ابھی کچھ دنوں بعد جو شاندار جلوس نکلنے والا ہے اس میں آپ یہی کپڑے پہنیے۔ واہ۔ لاجواب۔

غرض سب نے یہی ظاہر کیا کہ وہ کپڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ مہاراجہ نے فوراً اپنے پاس سے وہ پھول ان دونوں ٹھگوں کو دیے کہ وہ اپنے کوٹ کے کاج میں لگائیں اور دونوں کو شاہی جلاہے کا خطاب بھی عطا کیا ہے۔

جلوس کے دن کا سب کو بڑا انتظار تھا۔ دو دن پہلے ان ٹھگوں نے سوار بڑی مشعلیں لگا کر سب پر واضح کر دیا وہ راتوں کو جاگ جاگ کر کس قدر محنت سے کام کر رہے ہیں۔ پھر ان دونوں نے اس طرح ظاہر کیا کہ وہ مشینوں سے کپڑا نکال کر مناسب ٹکڑے کاٹ رہے ہیں، بڑی بڑی قینچیاں ہوا میں چل رہی تھیں اور وہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کر دینا چاہتے تھے۔

پھر آخر ایک دن ان دونوں ٹھگوں نے اعلان کر دیا کہ مہاراجہ کے نئے کپڑے تیار ہیں۔ مہاراجہ اپنے انتہائی سچے اور شریف آدمیوں کے ساتھ ایک بار پھر ان ٹھگوں کے پاس پہنچا۔ دونوں ٹھگوں نے اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا یہ آپ کا پتلون ہے— یہ آپ کا کوٹ ہے اور

یہ باقی کپڑے ہیں۔ یہ سارے کپڑے اس قدر ہلکے اور نفیس ہیں کہ مکڑی کا جالا بھی وزن دار ہوگا اگر کوئی پہن لے تو اسے محسوس بھی نہیں ہوگا کہ اس نے کچھ پہنا ہے۔

’’دیکھیے کیسا عمدہ کپڑا ہے۔‘‘

’’بے شک بے شک سب کے سب چلا اٹھے حالانکہ ان میں سے کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔‘‘

پھر ان دونوں ٹھگوں میں سے ایک نے کہا ’’حضورِ والا۔ اگر آپ اپنے کپڑے اتار دیں تو ہم آپ کو یہ نئے کپڑے پہنانے کی کوشش کریں گے۔ آپ اپنے لباس کو اس آئینے میں دیکھ بھی سکتے ہیں۔‘‘

مہاراجہ نے خوشی خوشی اپنے کپڑے اتار دیے، دونوں ٹھگ اس طرح کی حرکتیں کرنے لگے جیسے وہ اپنا بنایا ہوا نیا لباس مہاراجہ کو پہنا رہے ہیں۔

نیا لباس پہنا کر وہ مہاراجہ کو چاروں طرف سے دیکھنے لگے اور ایک بڑے آئینے کے سامنے گھمانے لگے تاکہ وہ اپنے لباس کو اچھی طرح دیکھ سکے اور لباس پر ناز کر سکے۔

دونوں ٹھگوں نے کہا ’’حضور آپ پر یہ لباس خوب سج رہا ہے۔‘‘

سب لوگ چلا اٹھے سچ مچ نیا لباس خوب ہے واہ کیا اس کا رنگ ہے کیا ڈیزائن۔

پھر بوڑھے وزیر نے مہاراجہ سے کہا ’’حضور باہر شامیانہ۔‘‘

مہاراجہ نے کہا ’’بہت خوب ہم بھی تیار ہیں اور پھر آئینے پر ایک آخری نظر ڈالی اور کہا واقعی یہ ایک انوکھا لباس ہے بہت عمدہ ہے۔

دو آدمیوں نے مہاراجہ کے پیچھے ہوکر اس طرح لباس اٹھا لیا جیسے وہ لباس کو خراب ہونے سے بچا رہے ہیں۔ اس طرح مہاراجہ جلوس کی جانب بڑھا۔

جلوس روانہ ہوا۔

مہاراجہ اپنا انوکھا لباس پہن کر سڑکوں سے گزرنے لگا۔

سڑکوں کے مکانوں کی کھڑکیوں سے آوازیں آنے لگیں ’’واہ، خوب، لاجواب۔‘‘ مہاراجہ کا نیا لباس بے حد شاندار ہے، خوب سلائی اور پھر لباس کا پچھلا حصہ کیا کہنے اس کے۔ اچھا ہوا جو مہاراجہ کے پیچھے دو آدمی لباس کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

ورنہ راستے سے یہ لباس خراب ہوجاتا۔

مجمع میں سے یا کھڑکیوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مہاراجہ کے جسم پر کوئی لباس نہیں ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کہنے پر ہر شخص نالائق اور بیوقوف سمجھا جائے گا۔

مگر اچانک ایک ننھے سے لڑکے نے پکارا ’’مہاراجہ کے جسم پر تو کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘ ننھے لڑکے کا اتنا چلانا تھا کہ سارا مجمع چیخ اٹھا۔ ہاں ہاں مہاراجہ کے جسم پر کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ کیسا لباس ہے۔‘‘

مہاراجہ مجمع کی آوازیں سن کر تھر تھر کانپنے لگا اس نے سوچا کہ اتنے سارے لوگ تو غلط نہیں کہہ سکتے مگر اس جلوس کو بھی تو آگے بڑھنا ہے۔ وہ مجمع کی پرواہ کیے بغیر اور زیادہ اکڑ کر چلنے لگا اور پیچھے آنے والے درباریوں نے اور زیادہ احتیاط سے مہاراجہ کا وہ دامن سنبھال لیا، جو کہیں تھا ہی نہیں۔

■

ماخذ: اینڈرسن کی کہانیاں، **مصنف:** اظہر افسر
تیسری طباعت: 2010
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کہانی

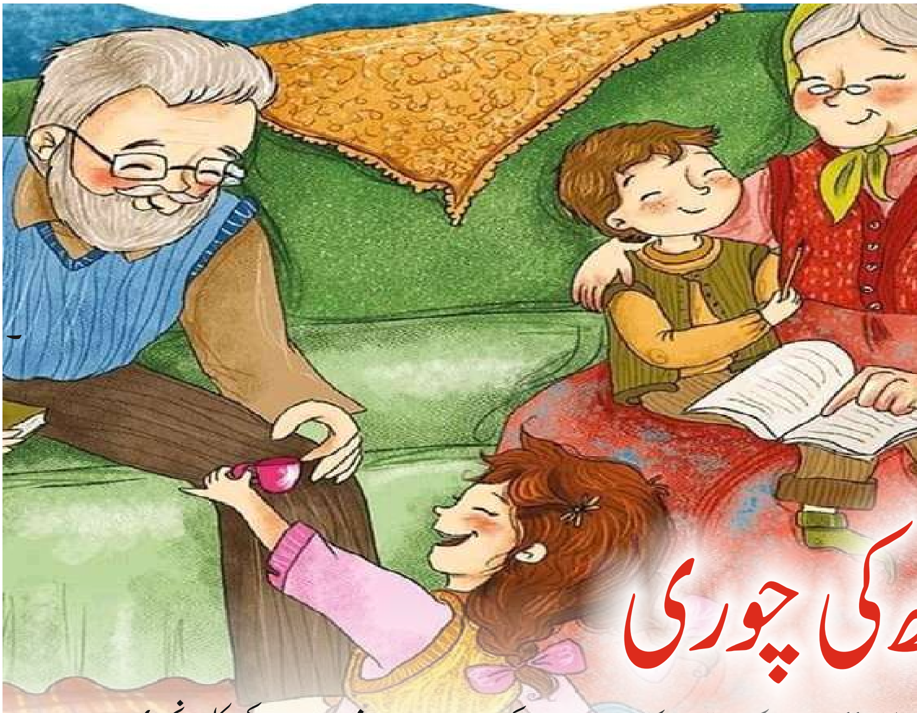

اقبال برکی

دودھ کی چوری

آواز آئی، ''دودھ لے لو!'' اور اسی کے ساتھ بیٹھک میں موجود ان دونوں بھائی بہنوں میں تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ ارشد اپنی باجی سے کہتا کہ 'تم جاؤ' اور اس کی باجی کہتی کہ 'تم جاؤ اور دودھ لے آؤ'۔ کچھ دیر تکرار چلتی رہی اور اسی کے ساتھ دونوں کا غصہ اور آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ آخر کچھ دیر بعد دادی نے نگار کو ڈانٹ کر چپ کرایا اور ارشد کو مخاطب کرتی ہوئی بولی، ''روز تو وہی بے چاری دوڑتی ہے۔ آج تم ہو، تو تم ہی لے آؤ! جاؤ جلدی کرو!''

دادی کی ڈانٹ سن کر ارشد کچھ نہ بولا لیکن باجی کو گھورتا ہوا اٹھا اور دودھ لینے چلا گیا۔

ارشد کچھ دیر بعد لوٹا۔ اس دوران بیٹھک میں صرف اشرف چاچا کی آواز گونج رہی تھی اور وہاں موجود تمام لوگ اُن کی طرف ہمہ تن گوش تھے۔ وہ ابھی گذشتہ کل ہی قطر سے لوٹے تھے اور گھر والوں سے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے۔ اشرف چاچا کیمیکل انجینئر تھے اور وہاں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ ارشد خاموشی سے بیٹھک میں آیا اور سب کے درمیان سے ہوتا ہوا اپنی باجی کے قریب بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس نے شرارت کی اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو باجی کے ہاتھ سے مس کر دیا۔ اس کی باجی نے چونک کر ارشد کی طرف دیکھا اور پھر اس نے پلٹ کر ارشد کی پیٹھ پر دھپ سے ایک ہاتھ رکھ دیا۔ بیٹھک میں موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی امی نے انھیں گھور کر دیکھا تھا، مگر چونکہ سب لوگ موجود تھے اس لیے وہ کچھ بول نہ سکی۔ بچوں کے ابا نے صرف اتنا کہا، ''تم دونوں سیدھے اور خاموش بیٹھو!''

''ابو جی دیکھیے نا، ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ سے مجھے پچ کر رہا ہے!'' ارشد کی باجی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

دادا نے پوچھا، ''مگر اس کا ہاتھ ٹھنڈا کیوں ہے اور

ابھی کے ابھی ٹھنڈا کیسے ہو گیا؟''

تب دادی نے وضاحت کی اور کہا، ''جس برتن میں دودھ لاتے ہیں وہ دودھ کی وجہ سے خوب ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ دودھ اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ اگر برتن کچھ دیر اور ان کے ہاتھ میں رہے تو ان کے ہاتھ اینٹھ جائیں اور سردی سے سن ہو کر رہ جائیں!''

''ایسا؟ اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے دودھ!'' دادا حیران ہو کر دادی کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں۔ جلدی خراب نہیں ہوتا۔'' ارشد کے امتیاز چاچا نے مزید وضاحت کی۔

''ہاں، ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اتنا ٹھنڈا دودھ!'' دادا ابو اب بھی حیران تھے۔ وہ ایسے بدبدائے جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہوں۔

''ابا جی، یہ دودھ والے چوری کرتے ہیں۔'' اشرف انجینئر نے کہا۔

دادا دادی کے ساتھ باقی تمام لوگ بھی چونک کر انھیں دیکھنے لگے۔ اسی وقت دادا جی نے کہا، ''بیٹا اشرف، کیسی باتیں کرتے ہو؟ وہ دودھ کی چوری کیوں کریں گے؟ اور کوئی دودھ کی بھی چوری کرے گا؟''

''بھیا، گوالا تو ہمیں ناپ کر بالکل صحیح دیتا ہے۔ پھر وہ چوری کیسے کرے گا۔ اور روزانہ اتنا ہی دودھ ہوتا ہے۔'' ارشد کی امی نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''بھابھی، یہ تو میں ثابت کر دوں گا۔ لیکن آج ان دونوں کا امتحان ہے۔ اب یہ دونوں بتائیں گے کہ گوالا دودھ کیسے چوری کرتا ہے۔'' اشرف چاچا نے ارشد اور اس کی باجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے ہم کیسے بتائیں گے؟ ہم کیا جانیں کہ وہ کیا چوری کرتا ہے؟'' ارشد نے احتجاج کیا۔

''وہ تو تم کو ہی بتانا ہے۔ خیر کل دیکھیں گے!'' کہہ کر اشرف چاچا نے موضوع بدل دیا اور پھر اپنی باتوں کو جہاں سے ادھورا چھوڑا تھا، آگے بڑھا دیا۔

دوسرے دن وہ سب حسب معمول رات کا کھانا کھانے کے بعد بیٹھک میں جمع تھے کہ اسی وقت گوالے کی آواز آئی، ''دودھ لے لو!''

اشرف چاچا نے اپنی بھابھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''بھابھی، ایک دوسرے برتن میں ایک لیٹر دودھ الگ لے لیں اور یہاں لے آئیں۔''

کچھ ہی دیر بعد ارشد کی امی نے دودھ سے بھرا ایک برتن لا کر اپنی ساس کے سامنے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں اشرف چاچا نے ٹھنڈے مشروب کی ایک بڑی خالی بوتل اور ایک کنول کیف لا کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ جیسے ہی دادی نے دودھ کا برتن اشرف کی طرف بڑھایا انھوں نے کنول کیف کی مدد سے سارا دودھ بوتل میں انڈیل دیا۔ بوتل شاید دو لیٹر والی تھی اس لیے بوتل آدھی خالی رہ گئی۔ اشرف انجینئر نے جہاں دودھ کی سطح تھی وہاں پر مارکر پین سے نشان لگا دیا اور بوتل کو بند کر کے بھابھی کو دیتے ہوئے بولے، ''بھابھی اسے کچن میں کہیں رکھ دو لیکن فریج میں مت رکھنا! کل ان دونوں کا امتحان ہوگا۔''

ارشد نویں درجے کا طالب علم تھا جب کہ اس کی باجی اب بارہویں درجے میں سائنس کی طالبہ تھی۔ اشرف چاچا کے امتحان سے دونوں نے کچھ بے چینی سی محسوس کی تھی۔ ان کے علاوہ وہاں موجود ان کے دادا، دادی، بچوں

کی امی، ابو اور امتیاز چاچا بھی حیران تھے کہ انجینئر صاحب دونوں بچوں کا کیا اور کیسا امتحان لیں گے اور گوالا بھلا دودھ کی چوری کیوں کر کرے گا۔ وہاں موجود ہر ایک اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

دوسرے دن جب معمول کے مطابق رات کا کھانا کھا کر سب بیٹھک میں آ گئے اور گوالا بھی دودھ دے کر چلا گیا تو اشرف چاچا نے کہا، ”بھابھی، وہ کل والا دودھ لے آئیں۔“

بھابھی نے دودھ کی بوتل لا کر اپنی ساس کے سامنے رکھ دیا اور انھوں نے اٹھا کر اسے اشرف کی طرف بڑھا دیا۔

اشرف نے بوتل کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر کچھ بلند کیا اور کہا، ”دیکھ لیجیے، کل دودھ کی سطح جہاں تھی ہم نے وہاں نشان لگا دیا تھا۔لیکن آج اس کی سطح نشان سے کتنی نیچے گر گئی ہے۔ اس مطلب یہ ہے کہ یہ دودھ پورا ایک لیٹر نہیں ہے۔“

سب نے دیکھا کہ دودھ کی سطح نشان سے کافی نیچے گر گئی ہے۔ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نمایاں تھے اور آنکھوں میں سوالیہ نشان کہ آخر ایسا کیوں کر ہوا۔اشرف چاچا نے ارشد کی باجی کو مخاطب کیا اور بولے، ”نگار، تم بتاؤ، دودھ کیسے کم ہوا؟“

اس سے پہلے کہ نگار کچھ کہتی ارشد بول پڑا، ”باجی تھوڑا سا دودھ پی گئی ہوگی!“

بیٹھک میں قہقہوں کا ایک بے ساختہ قسم کا طوفان امڈ پڑا۔ اسی وقت باجی کا ایک ہاتھ اٹھا اور دھپ سے ارشد کی پیٹھ پر پڑا۔ دونوں میں ہمہ وقت ٹھنی رہتی اور موقع ملتے ہی جنگ چھڑ جاتی۔ لیکن اس وقت یہ جنگ طول نہ پکڑ سکی کیونکہ اشرف چاچا نے نگار کو دوبارہ مخاطب کیا اور بولے، ”ہاں نگار بولو۔ دودھ کیوں کم ہوا؟“

نگار نے ایک لمحہ اپنے چاچا کی طرف اور پھر اپنے ابو کی طرف دیکھا اور کہنے لگی، ”چاچا، پانی کی خاصیت ہے کہ جب وہ ٹھنڈا ہوتا ہے، اور اس کا درجہ حرارت نیچے گرتا ہے اور چار درجہ پر پہنچتا ہے تو پھیل جاتا ہے یعنی اس کا حجم بڑھ جاتا ہے اور برف بننے سے پہلے تک پھیلتا ہے۔کل دودھ اتنا سرد تھا کہ اس کا درجۂ حرارت چار درجہ سینٹی گریڈ سے بھی کم تھا اس لیے اس کے اندر پھیلاؤ تھا، یعنی اس کا حجم بڑھا ہوا تھا۔لیکن آج اس کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے اور پھیلا ہوا پانی پھر اپنی اصل حالت پر آ گیا ہے اس لیے دودھ کی سطح کم ہو گئی ہے۔“

نگار کی امی اور ابو کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ بیٹھک میں ایک لمحے کے لیے ایک خوشگوار خاموشی چھا گئی تھی۔اسی وقت دادا جی کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہے تھے، ”ارے یہ ہمارے بچے ہیں۔تعلیم حاصل کرنے والے اور اپنے علم پر غور کرنے والے پھر کوئی انھیں کیوں کر دھوکہ دے سکتا ہے۔ یہ طوطوں کی طرح رٹتے نہیں ہیں بلکہ اپنے علم کا برملا استعمال کرتے ہیں!“

دادا جی کے بعد کوئی کچھ نہ بولا لیکن وہاں موجود ہر ایک کو طمانیت کا احساس تھا کہ ان کے بچے پڑھائی لکھائی میں ہوشیار ہیں، اور جو پڑھتے ہیں اُسے سمجھتے بھی ہیں۔

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHADAD
Noor Bagh, Malegaon
Dist.: Nasik - 423203 (Maharashtra)
Mob.: 8329273266

پرویز مانوس

پوں پوں والے انکل

کہانی

قصبے کے پرانے اسکول کے باہر روزانہ ایک بوڑھا شخص کھلونے بیچنے آیا کرتا تھا۔اس شخص کا نام تو شاید کسی کو معلوم نہ تھا،مگر بچے اسے ”پوں پوں والے انکل“ کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی لاٹھی پر رنگ برنگے کھلونے لٹکائے بچوں کے لیے خوشیاں بکھیرنے وہاں پہنچتا۔اس کی کھلونے والی لاٹھی میں ہر طرح کے کھلونے تھے۔سیٹی، چھوٹی گاڑیاں،گیندیں، جھنجھنے گڑیائیں اور پوں پوں وغیرہ۔

جیسے ہی بچے اسکول سے باہر نکلتے، ان کی نظریں انکل کی طرف ہوتیں،اوران کے چہرے خوشی سے دمکنے لگتے تھے۔

”پوں پوں والے انکل“ کا دل بچوں کے لیے بہت نرم تھا۔اگر کبھی کسی بچے کے پاس پیسے نہ ہوتے،تو وہ انکل کے پاس آکر اداس ہو جاتا،انکل مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے اور بغیر کسی سوال کے اسے کھلونا دے دیتے۔بچوں کی معصومیت اوران کے چہروں پر خوشی انکل کے دل کو بھر دیتی تھی، وقت کے ساتھ انکل اور بچوں کے درمیان ایک محبت اور تعلق پیدا ہو گیا تھا۔

ایک دن، جب بچے اسکول سے باہر نکلے تو انھیں انکل کہیں نظر نہیں آئے۔بچوں کو تشویش ہوئی،مگر وہ سمجھے کہ شاید انکل کسی کام میں مصروف ہوں گے اسی لیے آج نہیں آسکے۔انھوں نے ایک دوسرے سے معلوم کیا لیکن کسی کو انکل کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، اگلے دن بھی انکل وہاں نہیں آئے، اور اسی طرح کئی دن گزر گئے۔اب بچوں کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔پھر راجو نے کہا۔

''ہوسکتا ہے وہ اپنے گاؤں چلے گئے ہوں۔''

''نہیں وہ جب بھی گھر جاتے ہیں ہم سے مل کر جاتے ہیں اور ہمیشہ اسکول کی چھٹیوں میں جاتے ہیں''، عشرت نے کہا۔

اسکول کے باہر کھلونے بیچنے والے کی جگہ خالی تھی اور بچوں کو انکل کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

منی، جو چوتھی جماعت کی ایک ذہین بچی تھی اور انکل کی بہت بڑی مداح تھی، اس نے اس دن اپنے دوستوں کو بتایا کہ اسے اپنے ڈیڈی سے پتہ چلا ہے کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ لیکن تمھارے ڈیڈی کو ان کی طبیعت کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟ تخیل نے آگے بڑھ کر پوچھا، تو اس نے بتایا کہ انھوں نے انکل کو ڈسپینسری سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا، پھر راجو نے سب کو بتایا کہ ''پوں پوں والے انکل'' بیمار ہیں اور اپنے کرائے کے چھوٹے سے کمرے میں اکیلے ہیں۔ یہ سن کر عشرت، منی کی دوست، بہت فکرمند ہوئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انکل کی مدد کرے گی۔

عشرت نے اپنی سہیلیوں کو بلایا اور ان کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا، ان میں سے کسی نے پہلے کبھی کسی بیمار کی مدد نہیں کی تھی، مگر ان کے دل میں انکل کے لیے محبت تھی۔ عشرت نے اپنی امی سے کچھ پیسے مانگے اور منی نے اپنی بچت کا کچھ حصہ دیا، پھر عشرت نے تخیل کے پاپا جو ایک ڈاکٹر تھے کو بھی ساتھ آنے کے لیے راضی کر لیا۔

عشرت اور اس کی سہیلیاں، منی، تخیل، راجو اور باقی بچے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ انکل کے کمرے تک پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے انکل کو کمزور حالت میں بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا۔

کمرے کی حالت بے حد خراب تھی، دیواروں سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔

کمرے کی کھڑکیاں بند رہنے سے چاروں جانب عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

کمرے میں ہر طرف برتن بکھرے پڑے تھے۔ ۔

ایک کونے میں کھلونوں والی لاٹھی پر لٹکے ہوئے غباروں سے ہوا خارج ہوگئی تھی۔

فرش پر پڑے ہوئے کپڑے بھی گندے ہوگئے تھے۔

عشرت نے اندر داخل ہوتے ہی کمرے کی کھڑکی کھول دی جس سے تازہ ہوا اندر داخل ہوئی۔

انکل نے آہستہ آہستہ سر اٹھا کر دیکھا تو انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کے آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے انکل کا معائنہ کیا تو پوچھنے پر انکل نے بتایا کہ اسے بخار ہوا اور وہ سرکاری ڈسپینسری سے کچھ دوائیاں لایا تھا لیکن بخار تیز ہوگیا اور پھر وہ بے جان سا ہوگیا، معائنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ انکل کو سینے میں انفیکشن ہوگیا ہے جس کی وجہ سے بخار بڑھ گیا۔ میں کچھ دوائیاں لکھ کر دیتا ہوں، صبح دوپہر اور شام میں لیتے رہنا، تھوڑا آرام کی ضرورت ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ کچھ دنوں میں صحت یاب ہو جائیں گے لیکن سب سے پہلے پوری طرح کمرے کی صفائی کی جائے، مجھے لگتا ہے اسی گندگی کی وجہ سے انھیں انفیکشن ہوگیا ہے، عشرت نے سب بچوں کی ڈیوٹی لگائی کہ اسی وقت کمرے کی صفائی کی جائے اور شام سے باری باری انکل کو کھانا وغیرہ پہنچائیں پھر اس کے دوستوں نے مل کر

کمرے کی صفائی وغیرہ کی اور انکل کا بستر باہر دھوپ میں ڈالا، پھر سب نے مل کر انکل کا خیال رکھنا شروع کیا، انھیں دوائیاں دیں، اور وقت وقت پر کھانا بھی دیا۔

بچوں کی دیکھ بھال سے رفتہ رفتہ انکل صحت یاب ہونے لگا۔

انکل نے بچوں کی محبت کو محسوس کیا اور ان کے ساتھ گزارے گئے لمحے ان کے دل کو سکون دینے لگے۔ بچوں نے کچھ دن تک انکل کی دیکھ بھال کی اور ان کا دل بہلانے کے لیے ان کے ساتھ وقت گزارا۔ اس محبت بھری خدمت نے انکل کو جلدی صحت یاب کر دیا۔

کچھ دن بعد انکل دوبارہ اپنے کھلونے بیچنے کے لیے اسی مقام پر آ گیا۔ بچے جیسے ہی اسکول سے باہر نکلے، انھیں دوبارہ انکل نظر آئے، تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دوڑتے ہوئے انکل کی طرف گئے اور خوشی سے چیخنے لگے، ''پوں پوں والے انکل واپس آ گئے! پوں پوں والے انکل واپس آ گئے۔''

انکل کو یہ سن کر بہت اچھا لگا، انکل نے مسکراتے ہوئے سب بچوں کا استقبال کیا اور کہا، ''تم سب میری زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ہو۔'' انھوں نے عشرت اور منی کو پیار سے دعا دی اور کہا، ''بچوں کی معصومیت اور ان کی محبت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ تم نے جو میرے لیے کیا، اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' جب کہ آپ کا میرا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا پھر بھی آپ سب نے میری اتنی خدمت کی۔

رشتہ کیوں نہیں تھا؟ انسانیت کا رشتہ سب سے بڑا رشتہ ہوتا ہے۔ ہم نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ انسان ہونے کا فرض ادا کیا ہے، عشرت نے بڑے پیار سے کہا۔''

جب میں اپنے گاؤں چلا جاؤں گا وہاں سب کو یہ بات بتاؤں گا۔ عشرت نے کہا ''انکل آپ ہمارے مہمان ہیں اور پردیس میں ہیں، اس لیے آپ کا خیال رکھنا ہمارا فرض تھا۔

اب ہر بار جب بچے انکل کے پاس آتے، وہ ان سے اپنا خاص خیال رکھنے کی باتیں کرتے تھے۔ بچوں نے انکل کے ساتھ ایک ایسا رشتہ بنایا تھا جو نہ صرف محبت پر مبنی تھا بلکہ اس میں انسانی ہمدردی اور خدمت کا جذبہ بھی شامل تھا۔

یہ سب اس سبق کا ردعمل تھا جو ماسٹر جی بچوں کو کلاس میں پڑھاتے تھے کہ ہمیں بے سہارا لوگوں کی مدد کرنی چاہیے، بیماروں کی تیمارداری کرنی چاہیے کیونکہ مدد اور محبت ایک ایسی طاقت ہے جو مشکل ترین لمحے میں بھی کسی کو سہارا دے سکتی ہے۔ عشرت اور اس کے دوستوں نے یہ ثابت کر دیا کہ عمر اور تجربے سے زیادہ اہم دل میں کسی کے لیے محبت اور مدد کا جذبہ ہوتا ہے۔ پوں پوں والے انکل کی آنکھوں کے سامنے اب ہر وقت ان ہمدرد بچوں کے چہرے رقص کرتے رہتے جنھوں نے اس کی خدمت کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتے عشرت نے کتنی اچھی بات کہی ''رشتے تو احساس کے ہوتے ہیں، انسانیت کے ہوتے ہیں۔''

■

Parvez Manoos
Azad Basti, Nattipura West
Srinagar - 190015
Mob.: 9419463487
parvezmaanous2020@gmail.com

کہانی

عادل حیات

موبائل فون

ویسے تو گھر میں دو دو موبائل فون تھے۔ایک ابو کا، جسے وہ اپنے ساتھ آفس لے جاتے تھے اور دوسرا امی کے پاس تھا۔امی کا موبائل چونکہ بہت پرانا ہو گیا تھا۔اس میں بچوں کی دلچسپی کے لائق کوئی فیچر بھی نہیں تھا۔چنانچہ زیادہ تر وہ گھر کے کسی ٹیبل یا فریج کے اوپر ہی پڑا رہتا تھا۔اس کا مصرف بس اتنا تھا کہ امی اپنے والدین سے اور بچے کبھی کبھی اپنے دوستوں یا استاد کو فون کر لیا کرتے تھے۔

ان دنوں ٹی وی اور اخباروں میں نئے نئے موبائل فون کا اشتہار آنے لگا تھا۔جس پر بچوں کی گہری نظر ہوا کرتی تھی۔وہ چاہتے تھے کہ پڑوس میں رہنے والے انکل کی طرح ان کے ابو بھی ایک نیا موبائل فون خرید لیں۔جس میں نئے نئے فیچر اور بہت سے گیم ہوں۔وہ موقعے کی تلاش میں رہنے لگے۔ایک دن ابو آفس سے واپس آنے پر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ان کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ بھی تھا۔معلوم ہوا کہ ابو کا پرموشن ہو گیا ہے اور ان کی تنخواہ بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو گئی ہے۔

یہ اچھا موقع تھا جسے بچے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔انھوں نے مٹھائی کھاتے ہوئے آپس میں مشورہ کیا۔ابو سونے کے لیے جانے لگے تو وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔بچوں نے پہلے پرموشن کی مبارک باد دی۔اس کے بعد ابو سے کہنے لگے:

”ابو ہمارا موبائل بہت پرانا ہو گیا ہے.....اب ایک نیا موبائل سیٹ خرید لیں“

”لیکن بیٹا... ہمارے پاس دو دو موبائل پہلے ہی سے موجود ہے...اور ہمیں صرف بات ہی تو کرنی ہے۔“

”ابو ہمارا موبائل بہت ہی پرانا ہو گیا ہے... اس میں کوئی نیا فیچر بھی نہیں... ایک نیا موبائل لے لیں تاکہ ہمیں بھی نئے فیچروں سے استفادہ کرنے کا موقع مل سکے۔“

حامد نے ابو کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔بات تو صحیح تھی۔زمانہ ترقی کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور وہ تھے کہ پرانے زمانے کے موبائل فون کو ہی اپنے ساتھ ڈھوتے پھر رہے

تھے۔ ابو صبح سے شام تک دفتر کی ڈھیر ساری فائلوں میں سر کھپاتے رہتے تھے۔ انھیں دوسرے کاموں پر دھیان دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ ان کے لیے موبائل فون صرف باتیں کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس لیے بہت سے فیچر والے موبائل فون کی انھیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کہ امی کے پرانے موبائل کو بدل کر ایک نیا موبائل لے آئیں گے۔ امی کا موبائل چونکہ گھر میں ہی رہتا ہے اور بچے بھی اس کا استعمال بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ موبائل فون خریدنے سے پہلے وہ بچوں کی ذہنی ورزش کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بچوں کے سامنے شرطیں رکھیں اور کہا کہ آفس سے لوٹنے کے بعد اگر میرے ان سوالوں کے جواب صحیح صحیح دے دیے تو اگلے دن ایک اچھا سا موبائل فون گھر میں آجائے گا۔ ان کا سوال تھا:

1 فون کس نے اور کب ایجاد کیا؟

.2 موبائل فون کی ایجاد کس نے اور کس ملک میں کی؟

3 موبائل فون کا اصل نام کیا ہے۔

ان سوالوں کو سن کر حامد اور اس کے دوسرے بھائیوں نے سر ہلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے باتیں کیں اور اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے:

"ہمیں آپ کی شرطیں منظور ہیں... ہم آپ کے ان سوالوں کے جواب ضرور دیں گے۔"

اس کے بعد وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ امی کچن میں چلی گئیں اور ابو آفس کی فائلیں لے کر بیٹھ گئے۔ بچے بھی اپنے اپنے کمروں میں جا کر پڑھنے لگے۔ دوسرے دن ابو آفس سے جلد ہی گھر واپس آ گئے۔

سب سے پہلے وہ ضروریات سے فارغ ہوئے اور کھانا کھانے کے بعد بچوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان سے دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا اور پڑھائی لکھائی سے متعلق سوالات کیے۔ پھر انھوں نے موبائل فون سے متعلق اپنے سوالوں کو دہرایا۔ پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے حامد نے کہا:

"ابو!... فون کی ایجاد گراہم بیل نے 1875 کے آس پاس کی تھی۔"

جواب سن کر ابو بہت خوش ہوئے اور اسے شاباشی دی۔ اسی درمیان حامد کے منجھلے بھائی نے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ابو... یہ سچ ہے کہ فون کی ایجاد گراہم بیل نے پچھلی صدی کے آخر میں کی تھی لیکن موبائل فون کے سلسلے میں مارکونی نام آتا ہے۔ موبائل فون دراصل فون کی نئی شکل ہے۔ جسے چند دہائی قبل بہت شہرت ملی۔"

ابو نے اس کی طرف پیار سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ بچوں نے بڑی محنت کے ساتھ اپنا ہوم ورک کیا ہے اور موبائل سے متعلق ساری جانکاری حاصل کر لی ہے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ بچے ان کے تیسرے اور آخری سوال کا جواب بھی آسانی سے دے دیں گے۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا:

"موبائل فون کی ایجاد برطانیہ میں ہوئی لیکن استعمال پہلی بار امریکہ میں کیا گیا... اس کا اصل نام سیلولر فون یعنی سیل سے چلنے والا فون ہے۔"

اس پر ابو نے اس کی بھی تعریف کی اور موبائل فون

کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے۔

اس کے بعد ابو اس وعدے کے ساتھ کہ کل بہت سے فیچر والا ایک نیا موبائل فون آجائے گا، سونے کے لیے چلے گئے۔ بچے بھی نئے موبائل کا تصور اپنی آنکھوں میں سجائے بستر پر دراز ہو گئے۔

صبح ہوتے ہی سب سے پہلے حامد کی آنکھ کھلی۔ اس نے اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی جگایا۔ آج چونکہ اتوار کا دن تھا، اس لیے بچوں کے ساتھ ابو کی بھی چھٹی تھی۔ لہٰذا وہ آسانی کے ساتھ موبائل خریدنے کے لیے بازار جاسکتے تھے۔ انھوں نے جلدی سے ہاتھ منہ دھویا اور اتنے میں امی نے ناشتہ بھی تیار کر دیا۔ سبھی نے مل کر ایک ساتھ ناشتہ کیا اور موبائل فون خریدنے کے لیے بازار چلے گئے۔ دکان کے اندر مختلف کمپنیوں کے موبائل فون دکھائی دیے۔ انھوں نے ایک مشہور کمپنی کا انڈورائڈ موبائل فون پسند کیا۔ ابو نے اس کی قیمت ادا کی اور وہ لوگ نئے موبائل کے ساتھ گھر واپس آگئے۔

اس دن کے بعد سبھی بچے موبائل فون کے پیچھے پڑ گئے۔ ذرا سی فرصت کیا ہوئی موبائل فون لے اڑے۔ اس میں چونکہ نئے نئے فیچروں کے ساتھ بہت سے گیم بھی تھے، اس لیے بچوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ وہ ایک گیم کو کھیلتے ہوئے تھک جاتے تو دوسرا گیم کھول لیتے۔ اس میں بھی مزہ نہیں آتا تو نیٹ پر نئی نئی چیزیں تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ کچھ دنوں تک تو ان کے درمیان اتحاد قائم رہا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا موبائل فون کے لیے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ کوئی کہتا کہ اسے میں پہلے چلاؤں گا اور کوئی کہتا کہ میں چلاؤں گا۔ اس

بات کو لے ان کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت تک آجاتی۔ امی صلح کرانے ضرور آتیں لیکن ان کی کوئی نہیں سنتا۔ ایک ابو ہی تھے کہ جن سے بچے تھوڑا بہت ڈرتے تھے لیکن ان کا سارا وقت آفس کے کاموں میں گزر جاتا تھا۔ امی انھیں بچوں کے بارے میں بتانا چاہتی تھیں لیکن ان کی مصروفیت کو دیکھ کر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھتی تھیں۔ ایک دن موبائل کو لے کر ان کے درمیان جھگڑا اس قدر بڑھا کہ حامد کے بڑے بھائی نے اسے دھکا دے دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا اور دیوان سے زمین پر آ گرا۔ جس سے اس کے داہنے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ خبر ابو تک پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انھوں نے حامد کے بڑے بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہا:

’’بیٹا پہلے بھی میں نے بتایا تھا کہ موبائل بات کرنے کے لیے ہے..... گیم کھیلنے یا اس طرح کی دوسری چیزوں کے لیے نہیں..... دیکھو تمہاری اس نادانی نے بھائی کے ہاتھ میں فریکچر کر دیا۔‘‘

حامد کا بڑا بھائی پہلے ہی اپنی غلطی پر نادم تھا۔ جب ابو کی نصیحت سنی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ابو نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید کہا:

’’بیٹے! اچھے بچے وہی ہوتے ہیں... جن کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمھیں اپنی غلطی کا نہ صرف احساس ہے بلکہ تم اس پر نادم بھی ہو۔‘‘

اسی درمیان نرس حامد کو اپنے ساتھ پلاسٹر روم میں لے کر چلی گئی۔ جہاں اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھانا تھا۔ سبھی لوگ پلاسٹر روم کے باہر لگی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ابو نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ انھوں نے موبائل فون کے فائدے اور نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے بہت سے مشہور واقعات سنائے۔ کچھ دیر بعد حامد پلاسٹر روم سے باہر آ گیا اور اسے لے کر سب واپس گھر آ گئے۔

دن گذرتے رہے اور بچوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس سال ابو نے گرمی کی چھٹیاں شملہ میں گزارنے کا پلان بنایا۔ بچے بھی خوشی خوشی شملہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ پورے ایک مہینے کی چھٹیاں شملہ میں گزار کر جب ہوائی جہاز سے دہلی ائیر پورٹ پر پہنچے تو اس وقت صبح کے تقریباً تین یا ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ابو اتنی صبح صبح کسی کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ڈرائیور کو ائیر پورٹ پر گاڑی لانے سے منع کر دیا اور کرائے کی ایک ٹیکسی لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد ابو کو اندازہ ہوا کہ ڈرائیور ان کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چل رہا ہے۔ اچانک انھیں کسی انجانے خطرے کا احساس ہوا اور وہ اپنا موبائل فون نکال کر پولس افسر کے انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کی باتوں کو سن کر پہلے تو امی چونکیں اور بچے بھی ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ ابو نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی باتیں جاری رکھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی ابو کی بتائی ہوئی سمت میں رواں دواں تھی۔ جب ٹیکسی گھر کے سامنے آ کر رکی تو ڈرائیور نے پھرتی دکھاتے ہوئے دروازہ کھولا اور ان کے سامان کو ایک ایک کر کے کمرے کے اندر پہنچانے لگا۔ اس درمیان ابو نے اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ نہیں مانا بلکہ سارا سامان گھر کے اندر پہنچا کر ہی دم لیا۔ جب سامان محفوظ طریقے سے گھر کے اندر پہنچ گیا تو ابو نے ڈرائیور کو کرایہ

دیا۔ جسے لینے سے پہلے وہ انکار کرتا رہا لیکن ابو کے سمجھانے پر آخر کار روپیہ لے لیا اور بڑی تیزی کے ساتھ گاڑی کو بیک کر کے اڑن چھو ہو گیا۔

اس کے بعد ابو گھر میں داخل ہوئے تو امی نے جھوٹ موٹ کے پولس افسر بننے سے لے کر اب تک کے واقعے کے بارے میں سوال کیا۔ جس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے جو بات بتائی وہ سب کے ہوش اڑانے والے تھی۔ ان کے مطابق ٹیکسی کا ڈرائیور ایک لٹیرا تھا۔ جو موقع دیکھ کر انجانے مسافر کو لوٹ لیا کرتا تھا۔ اس نے انھیں بھی شہر میں انجانا سمجھ کر ان کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹکانا چاہا تاکہ آسانی کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کر سکے۔ راستہ چونکہ ان کا دیکھا بھالا تھا۔ اس لیے وہ ڈرائیور کی نیت کو بھانپ گئے۔ انھوں نے اپنا موبائل فون نکالا اور ایک پولس افسر کے انداز میں جھوٹ موٹ کی گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے آگے کہا کہ میرے اس روپے سے تم لوگوں کو حیرت ہوئی مگر وہ لٹیرا جھانسے میں آ گیا اور ہمیں صحیح سلامت نہ صرف اپنی منزل پر لے آیا بلکہ سامان کو بھی گھر کے اندر پہنچانے میں بھی مدد کی۔ ذرا سوچو اس وقت میرے پاس موبائل فون نہیں ہوتا تو کیا ہوتا۔

ان کی باتوں کو سن کر امی نے اسی وقت ہاتھ بلند کیے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ بچے ابو کی عقل مندی پر نازاں دکھائی دینے لگے۔ وہ موبائل فون کی خوبیوں اور برکتوں پر باتیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ ان کے مطابق اگر موبائل فون نہیں ہوتا تو ابو کی عقل مندی بھی کام نہ آتی اور انھیں اپنے ساز و سامان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔

■

Dr. Adil Hayat
37/89, G.Flr., Woodside Appt.
S. No. 01, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar, New Delhi-110055
Mob.: 09313055400 / 08802722160
adilhayat10@gmail.com

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 , Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

عیدو

کہانی

محمد نجیب پاشا

کل عید ہونے کی وجہ سے آج بازار میں چہل پہل اور رونق بڑھی ہوئی تھی۔ امی طرح طرح کے پکوان بنانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ سچ پوچھیے تو عید کے دن سب سے زیادہ خوشی بچوں کو ہی ہوتی ہے کیونکہ عید کی نماز کے بعد انھیں عیدی جو ملتی ہے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے ہیں، گلے ملتے ہیں، سویاں کھاتے ہیں، مبارکباد دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ گویا زمین و آسمان کی ہر شے کی عید ہو۔ میں یہ سوچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا کہ دادی جان کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، ''رمضان المبارک کے آخر میں جب شوال کا چاند نظر آتا ہے تو ہم مسلمان عید مناتے ہیں۔''

''دادی جان! ہم لوگوں نے مغرب کے وقت جو چاند دیکھا ہے۔ اسے شوال کا چاند کہتے ہیں؟'' ننھی شاہین نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں''۔ دادی جان نے شاہین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دادی جان! میں نے سنا ہے کہ عید کے معنی خوشی کے ہوتے ہیں۔ افضل نے فوراً سوال کر ڈالا۔

''ہاں بیٹا عید کے معنی خوشی کے ہوتے ہیں''۔

''دادی جان! فطرہ کیا ہوتا ہے؟'' حمید فوراً بول پڑا۔

''عید کی نماز سے پہلے جو رقم غریبوں میں بانٹی جاتی ہے وہ فطرہ کہلاتی ہے۔'' فوزیہ بیچ میں بول پڑی۔

''ہاں ہاں! بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' دادی جان مسکراتے ہوئے بولیں۔

''دادی جان! عید کی کوئی مزے دار کہانی سنائیے''۔ سعدیہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

ہاں دادی جان! کوئی اچھی سی کہانی عید پر سنائیں۔'' سبھی بچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''اچھا۔ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر دادی جان نے اپنی عینک صاف کی اور پھر یوں گویا ہوئیں۔

لکھی پور گاؤں میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام عیدو تھا۔عیدو بڑا ہی نیک اور فرمانبردار تھا۔ وہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام گاؤں والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

''دادی جان! ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس لڑکے کا نام عیدو کیوں تھا۔''سعدیہ نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ بھلا عیدو بھی کوئی نام ہوتا ہے۔''حمید بول پڑا۔

دادی جان مسکراتے ہوئے بولیں''بات دراصل یہ ہے کہ عیدو کی پیدائش عید کے دن ہوئی تھی اس لیے اس کے والدین اسے پیار سے عیدو کہا کرتے تھے۔''

''اچھا یہ بات ہے۔''حمید نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''دادی جان! آگے کی کہانی سنائیے نا۔'' ننھی شاہین نے بے صبری سے کہا۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ عیدو بہت ہی نیک دل لڑکا تھا لیکن جہاں اس کے اندر ڈھیر ساری خوبیاں تھیں وہیں ایک برائی بھی تھی اور وہ برائی یہ تھی کہ کسی بھی کام کو تاخیر سے انجام دیتا تھا۔جس کی وجہ سے اسے اکثر کلاس میں شرمندہ ہونا پڑتا اور گھر میں امی ابو الگ خفا رہتے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دوست اسے اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے لے جانا چاہتا تو جب تک اس کے گھر اس کا دوست نہیں آتا وہ تیار نہ ہوتا تھا، جس کی وجہ سے اس کے دوست بھی اس سے ناراض ہو جایا کرتے تھے۔

آج چونکہ عید کا دن تھا اس لیے جیسے ہی عید کی نماز ختم ہوئی بچوں کی ایک بڑی تعداد اختر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑی۔ کیونکہ اختر صاحب محلے کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور ہر سال بچوں کو عیدی بھی دیا کرتے تھے۔عیدو بھی عید کی نماز ختم ہوتے ہی دوسرے بچوں کے ساتھ عیدی لینے کے لیے اختر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔

عیدو کو دیکھتے ہی اختر صاحب مسکراتے ہوئے بولے،عیدو! آج میں تمھیں ایسی عیدی دوں گا جو ہمیشہ تمھارے کام آئے گی۔''

''کس طرح کی عیدی سر؟''عیدو نے بے چینی سے پوچھا۔

''یہ لو۔''ایک لفافہ اختر صاحب نے عیدو کو دیتے ہوئے کہا۔

''سر! یہ کیا ہے؟''عیدو نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم خود ہی کھول کر دیکھ لو۔''

عیدو نے آہستہ آہستہ لفافہ کھولا۔ اس میں صرف کاغذ کا ٹکڑا تھا جس میں کچھ لکھا ہوا تھا۔اسے پڑھ کر عیدو شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

''سر! مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

اگر تم اس قول پر چلتے رہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا علم بیکار نہیں گیا۔''اختر صاحب نے عیدو سے کہا۔

''سر! آج میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اس قول پر چلتا رہوں گا۔''عیدو نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''بہت خوب۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

اس دن کے بعد سے عیدو وقت کی پابندی کرنے لگا اور تمام لوگ اس سے اور زیادہ خوش رہنے لگے اور زیادہ پیار کرنے لگے''۔

''دادی جان! آخر اس کاغذ میں کیا لکھا ہوا تھا؟'' حمید نے کہا۔

''ہاں دادی جان! آخر اس کاغذ میں کیا لکھا ہوا تھا۔'' سعدیہ نے بھی زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''بتاتی ہوں کہ کاغذ میں کیا لکھا ہوا تھا۔ اتنا کہہ کر دادی جان نے سبھی کے چہرے دیکھے۔

''جلدی بتایئے نا دادی جان۔'' فوزیہ نے بےصبری سے کہا۔

''یہی کہ وقت ان لوگوں سے غداری کرتا ہے جو اس کا ساتھ نہیں دیتے، اس کے ساتھ نہیں چلتے، پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہیں۔ وقت کے چھوٹے چھوٹے لمحے سونے کے ذرے ہیں۔ انھیں بیکار کے کھنڈرات میں بکھیر کر ضائع مت کرو۔'' اتنا کہہ کر دادی جان چپ ہوگئیں۔

''واقعی دادی جان! آپ کو کہانی سنانے کا گن آتا ہے۔ لیکن مجھے اس کے قول نے متاثر کیا ہے۔'' حمید بول پڑا۔

''ہاں دادی جان! وقت ایک قیمتی شے ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہم لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔'' افضل نے کہا۔

''ہاں افضل بھائی! آپ کی بات سو فیصدی سچ ہے۔'' سعدیہ بولی۔

''دادی جان! آپ مجھے عیدی میں کیا دیں گی؟ ننھی شاہین نے معصومیت سے پوچھا۔

''ایک پان اور کیا۔'' فوزیہ نے چڑھایا اور سب ہنس پڑے۔

''اچھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ لڑکا عیدو کون تھا؟'' دادی جان بولیں۔

''نہیں۔'' سبھی نے یک زبان ہو کر کہا۔

''تمھارے ابو اور کون۔'' دادی جان نے سبھی کو حیرت میں ڈالتے ہوئے کہا اور ہم سب بچوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

■

Md. Najeeb Pasha
B-119, Nawab Wajid
Ali Shaha Road Kol-700024(West Bengal)
Mob:6290479899
mdnajeebp@gmail.com

کہانی

فیصل اور چیونٹی

محمد رہبر عالم

اسکول کی چھٹی ہوچکی تھی، تمام بچے کلاس روم سے باہر نکل چکے تھے، اسکول کا صحن بچوں سے بھر چکا تھا، کوئی بستہ اٹھا رہا تھا، کوئی اپنی سائیکل لے کر صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا، جن کے پاس بائک تھی وہ بائک اسٹارٹ کر کے جلدی سے گھر نکلنا چاہ رہے تھے، اسکول بس سے جانے والے بچے بس میں سوار ہوچکے تھے، بہت جلد اسکول کا صحن خالی ہوگیا۔ بچوں کی بھیڑ چھٹ گئی، صرف اساتذہ اور دیگر اسکول اسٹاف ہی بچے تھے، ایک دو بچے دھیرے دھیرے اب بھی نکلتے ہوئے نظر آ رہے تھے، مگر فیصل پارک میں لگی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھا تھا، برابر میں کتاب کا بستہ بھی تھا، جس میں کتابیں جیسے تیسے ٹھونسی ہوئی تھیں، وہ گم صم تھا، منہ لٹکا ہوا تھا، اسکول میں سناٹا چھا چکا تھا، پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا تھا، بت بنا بیٹھا تھا، چیونٹیاں اس کے پاؤں پر سے گزر رہی تھیں، اس کا بھی اسے احساس نہیں ہو رہا تھا، کسی اور دنیا میں کھویا ہوا تھا، ایک چیونٹی کئی مرتبہ اس کے پاؤں پر سے گزر چکی تھی، اسے بھی فیصل کے حرکت نہ کرنے سے تعجب ہو رہا تھا۔ جب چیونٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اس نے فیصل کے پاؤں میں آہستہ سے کاٹا، فیصل نے حرکت کی اور چیونٹی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا: کیوں مرے ہوئے کو مارنے کے چکر میں لگی ہوئی ہو؟

ارے بھائی! میں مار نہیں رہی ہوں، میں تو دیکھ رہی تھی کی واقعی تم انسان ہو یا پتھر، پتھر تو نہیں ہو؟

اب پتا چل گیا نا! میں انسان ہوں! پتھر نہیں ہوں! چلو! جاؤ! اب مجھے زیادہ پریشان مت کرو۔ فیصل لال پیلا ہو رہا تھا۔

میں تمھیں پریشان نہیں کر رہی ہوں۔ میں بار بار گزر رہی تھی، پھر بھی تم حرکت نہیں کر رہے تھے، اس وجہ سے میں نے تمھیں آہستہ سے کاٹا!

چلو اب تمھارے دل کی تمنا پوری ہوگئی نا، فیصل نے

بے رخی سے کہا۔

ارے بھائی اتنا غصہ کیوں ہو رہے ہو؟ میں نے تو ہمدردی میں تمھیں کاٹا تھا، چیونٹی نے کہا۔

ارے جاؤ، کوئی ہمدرد نہیں ہوتا ہے، سب مطلب کے یار ہوتے ہیں۔

ایسی بات مت کہو، دنیا میں ہمدردوں کی کمی نہیں ہے۔

دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اسکول کا ایک اسٹاف فیصل کے پاس آیا اور کہا:

تم ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے ؟ جاؤ! گھر جاؤ! چھٹی ہو چکی ہے، اب کل آنا۔

فیصل اپنی جگہ سے اٹھا ، بستہ اٹھایا اور چل پڑا، چیونٹی دیکھتی ہی رہ گئی ، وہ اس سے اور بات کرنا چاہ رہی تھی ، لیکن اسے مزید موقع نہیں مل سکا، اس نے اپنے دل میں کہا: کل وہ آئے گا تو اس سے بات کروں گی، اس کی اداسی کا سبب جان کر رہوں گی ، وہ اتنا اداس کیوں ہے؟ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔

فیصل گھر پہنچا، سورج ڈوبا ، چاند نکلا، تاریکی نے اپنے بازو پھیلائے، لیکن اونگھ بھر بھی وہ سو نہیں پایا، ذہن الجھا ہوا تھا، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا، ہر چیز بے رحم لگ رہی تھی۔

دوسرے دن والدہ نے صبح جگایا، نہلایا اور ناشتہ کرا کر اسکول روانہ کیا، اس کا منہ لٹکا ہوا تھا، والدہ بھی محسوس کر رہی تھیں، لیکن انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا، انھوں نے سمجھا کہ یہ اسکول جانے کی ناگواری ہے۔

اسکول پہنچنے کے بعد فیصل کلاس روم نہیں گیا، کل چھٹی کے بعد جس جگہ بیٹھا تھا، اس جگہ پہنچ گیا، کتابوں کا بستہ برابر میں رکھا اور منہ لٹکا کر بیٹھ گیا، چیونٹی تو فیصل کا انتظار کر رہی تھی ، فیصل کے پہنچتے ہی وہ بھی پہنچ گئی، آہستہ سے فیصل کے پاؤں میں کاٹا ، فیصل نے اس کی طرف دیکھا اور غصہ ہو کر کہا: تم پھر آ گئی ! میری پریشانی کو بڑھانے

کہانی

کے لیے۔

ارے بھائی! پریشانی کیا ہے؟ پہلے یہ تو پتہ چلے! ممکن ہے! بڑھنے کے بجائے کم ہوجائے۔

ارے جاؤ! تم میری پریشانی خاک کم کروگی! چلو جاؤ! بھاگو یہاں سے! فیصل کے چہرے پر ناگواری صاف جھلک رہی تھی۔

اتنا زیادہ غصہ مت کرو! زیادہ غصہ کرنا بری بات ہے، جہاں تک میری جسامت کا تعلق ہے تو کسی نے سچ کہا ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اتنا بضد ہو تو بتا دیتا ہوں! تاکہ تمھاری حسرت بھی پوری ہوجائے!

حسرت کیا پوری ہوگی؟ بس پتہ چل جائے گا۔

میں بہت کوشش کرتا ہوں لیکن سبق نہیں یاد ہو پاتا ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ سبق کیسے یاد کیا کروں؟ اسی میں میرا ذہن ہمیشہ الجھا رہتا ہے، انگلیاں چٹخاتے ہوئے فیصل نے کہا۔

یہ ہوئی نا بات! سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے تم منہ لٹکائے بیٹھے ہو!

ہاں! ہاں! اسی وجہ سے میں پریشان ہوں۔

بلاوجہ تم پریشان ہو رہے ہو، اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے، اطمینان کے ساتھ چیونٹی نے جواب دیا

کیا؟ کیا؟ کیسے پریشان ہونے کی بات نہیں ہے؟ سبق یاد نہیں ہو پاتا ہے۔

تم کوشش کرتے رہو! سبق کیسے نہیں یاد ہوگا۔

کتنی بار کوشش کروں؟

ابھی تم نے کوشش کہاں کی ہے؟ اگر کوشش کرتے تو ضرور یاد ہوتا، پرامید لہجے میں چیونٹی نے کہا۔

اب کیسے کوشش کروں ہمیشہ ذہن اسی میں الجھا رہتا ہے۔

سب سے پہلے تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ سبق یاد کرنا ناممکن ہے، اس کے بعد کوشش کرو، کیسے نہیں یاد ہوگا۔ مجھے دیکھو، میں اپنے سے دوگنی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہوں، صرف اور صرف یقین کے بل پر ہی ایسا کرپاتی ہوں۔ اگر میرا یقین ڈگمگا جائے تو میں ایسا ہرگز نہیں کرپاؤں گی، اگر تمھیں سبق یاد ہوجانے کا پورا یقین ہوجائے تو سبق ضرور یاد ہوگا، کسی بھی کام کو یقین کے ساتھ کیا جائے تو پایۂ تکمیل تک پہنچنا محال نہیں ہے۔ آئندہ سبق یاد کرنے بیٹھو تو پورے یقین کے ساتھ بیٹھو پھر دیکھو سبق کیسے یاد نہیں ہوتا ہے؟ منہ لٹکانے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا، مسئلہ تو صرف یقین اور اعتماد ہی سے حل ہوسکتا ہے۔

اگر یہ بات ہے تو میں صرف سبق ہی پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ یاد نہیں کروں گا بلکہ ہر کام کو پورے یقین کے ساتھ کروں گا۔ چیونٹی کی باتوں نے فیصل کے لیے راستہ دکھانے کا کام کیا۔

■

Md Rahbar Alam
K.B.C. Inter School Gauchhari Gogri
Khagaria - 851203 (Bihar)
Mob.: 8877656768
rahbar.khg@gmail.com

غلام قادر

وقت کی اہمیت

پیارے بچو! وقت ایک جادوئی خزانے کی طرح ہے ایک بار جو گزر جائے، وہ واپس نہیں آتا! اسی لیے اپنے وقت کی قدر کرنا بہت ضروری ہے۔ جب آپ اپنے وقت کو عقلمندی سے استعمال کرتے ہیں، تو آپ زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اپنے کام جلدی مکمل کر سکتے ہیں، اور حیرت انگیز چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔

آیئے جانتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کی عزت کیسے کر سکتے ہیں اور ہر لمحے کا بہترین استعمال کیسے کر سکتے ہیں۔

وقت کیوں اہم ہے؟ وقت کو اپنے ذاتی سپر پاور کے طور پر دیکھیں۔ ہر دن آپ کے پاس 24 گھنٹے ہوتے ہیں کہ آپ جو چاہیں کریں، سیکھیں، کھیلیں، آرام کریں، اور ترقی کریں۔ لیکن ایک راز ہے، آپ وقت کو بعد کے لیے بچا نہیں سکتے! ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد، وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

آیئے وقت کی اہمیت کو ایک کہانی سے سمجھتے ہیں۔

ایک گاؤں میں اسلم نام کا ایک لڑکا رہتا تھا جو وقت کو ضائع کرنے میں ماہر تھا۔ وہ سارا دن کھیل کود، سونے، اور غیر ضروری کاموں میں مصروف رہتا۔ اس کے والدین نے اسے بہت سمجھایا کہ وقت بہت قیمتی چیز ہے، لیکن اسلم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتا۔ ایک دن گاؤں میں ایک بوڑھا مسافر آیا۔ وہ بہت دانشمند دکھائی دے رہا تھا اور لوگوں کو اپنی باتوں سے متاثر کر رہا تھا۔ اسلم کے والد نے سوچا کہ شاید یہ بوڑھا اسلم کو وقت کی اہمیت سمجھا سکے۔ چنانچہ، انھوں نے اسلم سے کہا کہ وہ اس بوڑھے شخص سے ملاقات کرے۔

بوڑھے نے اسلم کو دیکھا اور کہا، ''بیٹا، تمھیں کیا لگتا ہے، وقت کیا چیز ہے؟'' اسلم نے بے دلی سے جواب دیا، ''وقت؟ وقت تو صرف گزرنے کے لیے ہے۔'' بوڑھا مسکرایا اور کہا، ''اگر میں تمھیں ایک خزانہ دوں جو صرف ایک دن کے لیے ہو، تو تم کیا کرو گے؟'' اسلم فوراً بولا،

”میں اسے استعمال کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ کچھ حاصل کرسکوں۔“ بوڑھے نے گہری سانس لی اور کہا، ”وقت بھی ایک خزانہ ہے، لیکن یہ تمھیں ایک دن یا ایک لمحے کے لیے دیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں، وہ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔“ یہ بات اسلم کے دل کو لگی، لیکن وہ ابھی بھی پوری طرح قائل نہ ہوا۔ بوڑھے نے ایک تجویز دی، ”اگر تمھیں وقت کی اہمیت سیکھنی ہے تو میرے ساتھ تین دن گزارو۔ میں تمھیں دکھاؤں گا کہ وقت کیسے کام کرتا ہے۔“ اسلم نے رضامندی ظاہر کی۔

پہلا دن: پہلے دن، بوڑھے نے اسلم کو گاؤں کے مختلف مقامات پر گھمایا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر کسی مقصد کے جاتے رہے۔ اسلم نے شکایت کی، ”یہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کوئی کام کیوں نہیں ہو رہا؟“ بوڑھے نے جواب دیا، ”یہی وہ وقت ہے جو ضائع ہو رہا ہے۔ اگر ہم اسے کسی اچھے مقصد کے لیے استعمال کرتے، تو کچھ حاصل کر لیتے۔“ اسلم نے سوچا کہ واقعی یہ وقت بیکار ضائع ہو رہا تھا۔

دوسرا دن: دوسرے دن، بوڑھے نے اسلم کو ایک فہرست دی جس پر دن بھر کے کام لکھے ہوئے تھے۔ اسلم کو حیرت ہوئی کہ کیسے ہر لمحے کا صحیح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے دن کی شروعات جلدی کی، گاؤں کے لوگوں کی مدد کی، کھیتوں میں کام کیا، اور مطالعہ بھی کیا۔ دن کے آخر میں اسلم نے محسوس کیا کہ وہ بہت کچھ سیکھ چکا تھا اور اس کے اندر ایک خوشی کا احساس تھا۔ بوڑھے نے کہا، ”دیکھا؟ وقت کا صحیح استعمال ہمیشہ خوشی دیتا ہے۔“

تیسرا دن: تیسرے دن، بوڑھے نے اسلم سے کہا کہ آج تمھیں اپنے وقت کا بہترین استعمال کرنا ہے۔ اسلم نے اپنی ترتیب بنائی اور کام شروع کیا۔ اس نے کھیلنے کے لیے بھی وقت نکالا، اپنے والدین کی مدد کی، اور ایک نئی کتاب بھی پڑھی۔ دن کے آخر میں بوڑھے نے اسلم سے پوچھا، ”کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“ اسلم نے کہا، ”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے اپنی زندگی میں کچھ اہم چیز کو حاصل کیا ہو۔“ جب اسلم اپنے گھر واپس آیا تو اس نے اپنے والدین سے کہا، ”میں نے سیکھ لیا کہ وقت ایک خزانہ ہے۔ اسے ضائع کرنا گویا اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو ضائع کرنا ہے۔“ اس دن کے بعد اسلم نے اپنا روزمرہ کا معمول بدل دیا اور وقت کو ضائع کرنا چھوڑ دیا۔

تو پیارے بچو! دیکھا آپ نے کہ وقت کا بہتر استعمال لوگوں کو سکون فراہم کرتا ہے اس کا ضائع انسان کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔

اسی لیے اس کہانی سے سبق حاصل کریں اور اپنے وقت کا صحیح استعمال کر کے زندگی کو کامیاب بنائیں۔

دن کا آغاز ایک منصوبے کے ساتھ کریں۔ ایک فہرست بنائیں وہ کام لکھیں جو آپ کو کرنے ہیں، جیسے کہ ہوم ورک مکمل کرنا، اپنا کمرہ صاف کرنا، یا کسی شوق کی مشق کرنا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ترجیحات مقرر کریں، سب سے اہم کام پہلے کریں تاکہ آپ بعد میں ان کے بارے میں فکر نہ کریں۔

ایک وقت میں ایک کام پر توجہ دیں، کیا آپ نے کبھی ایک ساتھ بہت سے گیندوں کو ہوا میں اچھالنے کی

کوشش کی ہے؟ یہ مشکل ہے، ایک وقت میں ایک کام کرنے سے آپ تیزی اور بہتر طریقے سے کام مکمل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کتاب پڑھ رہے ہیں، تو صرف پڑھنے پر توجہ دیں۔ کھلونوں کے ساتھ کھیلنے یا ویڈیوز دیکھنے کو بعد کے لیے چھوڑ دیں۔ وقت ضائع کرنے سے بچیں ایسی چیزیں کرتے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا، جیسے کہ ٹیبلیٹ پر اسکرول کرنا یا خیالی دنیا میں گم ہونا۔ جبکہ کھیلنا، کودنا اور دوستوں سے ملنا جلنا اچھی چیز ہے، لیکن یہ بات یقینی بنائیں کہ یہ آپ کے اہم کاموں میں رکاوٹ نہ بنے۔ کھیلوں یا ٹی وی دیکھنے کے دوران ٹائمر لگانے کی کوشش کریں تاکہ آپ زیادہ وقت ضائع نہ کریں۔

''نہیں'' کہنا سیکھیں کبھی کبھی دوست یا بہن بھائی آپ سے کچھ کرنے کو کہیں گے جب کہ آپ نے پہلے ہی کچھ اور طے کیا ہو۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں، ''ابھی نہیں، مجھے یہ پہلے ختم کرنا ہے۔'' وقت کی عزت کرنے کا مطلب ہے اس وقت آپ کے لیے بہترین چیز کا انتخاب کرنا۔ آرام کے لیے وقفہ لیں اپنے وقت کو عقلمندی سے استعمال کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ مسلسل کام کریں۔ وقفہ لینا بہت ضروری ہے! باہر کھیلیں، اسٹریچ کریں، یا دماغ کو تازہ کرنے کے لیے جھپکی لیں۔ اس سے آپ کو زیادہ توانائی ملے گی اور دوبارہ توجہ مرکوز کرنے میں مدد ملے گی۔

اپنی کامیابی کا جشن منائیں جب آپ وقت پر اپنے کام مکمل کریں، تو خود کو شاباشی دیں! شاید اپنی پسندیدہ چیز کھائیں یا اضافی کھیل کا وقت لیں۔ چھوٹی کامیابیوں کا جشن منانا آپ کو روزانہ وقت کی قدر کرنے کے لیے متحرک رکھتا ہے۔

پیارے بچو! وقت قیمتی تحفہ ہے۔ اس کی قدر کر کے، آپ کام اور کھیل کود میں توازن پیدا کر سکتے ہیں، اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں، اور خود پر فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ تو آج سے شروعات کریں، عقلمندی سے منصوبہ بنائیں، توجہ دیں، اور ہر لمحے کو قیمتی بنائیں! یاد رکھیں، جب آپ اپنے وقت کی عزت کرتے ہیں، تو آپ اپنے لیے ایک روشن اور خوشحال مستقبل تعمیر کرتے ہیں۔

■

Ghulam Qadeer
Research Scholar, Deptt of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

جواب

1. میونسپل کارپوریشن آف دہلی
2. انڈین ریلوے
3. 1000 کلوگرام
4. راجہ رام موہن رائے
5. جنرل ڈائر
6. B12
7. 206
8. Pumice Stone (جھاواں پتھر)
9. گورنر آف آر بی آئی
10. امیر خسرو
11. 8 مارچ
12. 48
13. کناڈا
14. سالم علی
15. Hangzhou
16. The Cerebrum
17. Dragon Bamboo
18. Heart&Lungs
19. بنگلور
20. منشی پریم چند

قسط 15

جنگل کی کہانی

رمیش نارائن تیواری

مترجمہ

زینت شہریار

پیارے بچو! ہر عمر کے لوگوں کو قصے اور کہانی سننے کا شوق ہوتا ہے، خاص طور پر بچپن میں کہانیوں سے دلچسپی ہوتی ہے اورسبق آموز کہانیوں سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ اسی وجہ سے دادی، نانی اور امی وغیرہ سے کہانیاں سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ بچوں کی پسندیدہ چیزوں میں جنگل اور جنگلی جانور کافی اہمیت کے حامل ہیں، بچے ٹیلی ویژن پر بھی ایسے کارٹون اور کہانیاں شوق سے دیکھتے ہیں۔

'جنگل کی کہانی' رمیش نارائن تیواری کی عمدہ کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ زینت شہریار نے کیا ہے، بھیڑیا، شیر، بندر، اژدھا، موگلی اور فا وغیرہ اس کتاب میں بیس کہانیاں شامل ہیں جو آپس میں مربوط ہیں۔ بچوں کی دلچسپی اور پسندکے پیش نظر 'جنگل کی کہانی' کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے امید ہے کہ اسے آپ پسند کریں گے اور ان سے سبق بھی حاصل کریں گے۔

اب تک آپ بھیڑیا اور گیدڑ، شیر خاں کی دھمکی، بھیڑیا گروہ میں موگلی کا مطالعہ، شیر خاں کی سازش، لال پھول کا کرشمہ، موگلی جنگل سے انسانوں کی بستی میں، شیر خاں کا خاتمہ، انسانی سماج سے اخراج، قسم پوری ہوئی، بندروں کی بری صحبت، موگلی بندروں کی قید میں، فا، اژدھا کی تلاش میں پڑھ چکے ہیں۔ 'چیل نے موگلی کاپیغام دیا' اور 'بندروں کا شیت نگر' میں بتایا گیا ہے کہ موگلی نے بڑی چالاکی سے چیل کے ذریعے اپنے دوستوں بھالو دادا اور بگھیراکو یہ پیغام بھجوادیاکہ بندر اسے لے کر شیت نگرجارہے ہیں،شیت نگرایک قدیم غیرآباد شہرتھاجو ایک گھنے جنگل سے گھراہواتھا، بندراس جگہ پر اکثرجمع ہوتے اورموج مستی کرتے،موگلی کا پتاچل جانے کے بعد اس کے دونو ں دوست اور فا اسے بندروں سے بچانے کے لیے شیت نگر کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ اب آگے (ادارہ)

شیت نگر کے کھنڈروں میں موگلی

چونکہ موگلی کی تعلیم وتربیت جنگل کے قانون کے مطابق ہوئی تھی اس لیے نہ تو اسے بندروں کی اس طرح کی زندگی سمجھ ہی میں آئی اور نہ پسند ہی آئی۔ بندر موگلی کو گھسیٹتے ہوئے شیت نگر میں جس وقت پہنچے تھے اس وقت

شام ہورہی تھی۔ وہاں پہنچ کر بجائے آرام کرنے کے، جیسے کہ موگلی نے اتنے طویل سفر کے بعد کیا ہوتا، وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اور موگلی کو بیچ میں گھیر کر اس کے چاروں طرف ناچتے اور بیوقوفی بھرے گانے گاتے رہے۔ اس کے بعد ایک بندر نے تقریر کی۔ اس تقریر میں اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ موگلی کو اپنے قبضے میں کرنا بندروں کی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ موگلی سے کہا کہ وہ انھیں سردی اور بارش سے حفاظت کے لیے ٹہنیوں اور لکڑیوں کے استعمال سے کس طرح جھونپڑی بنائی جاتی ہے، بنا کر دکھائے۔ اس پر موگلی نے کچھ موٹی بیلیں لے کر انھیں بنا شروع کیا۔ بندرں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی نقل کرنے کی کوشش کی، لیکن کچھ منٹوں میں ہی اس کام سے ان کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ وہ سب اپنے دوستوں کی دم پکڑ کر کھینچنے لگے یا کھونکھیاتے ہوئے اچھلنے کودنے لگے۔

''میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔ موگلی نے کہا''۔ میں جنگل کے اس حصے میں بالکل اجنبی ہوں۔ مجھے کھانے کے لیے لادو، یا پھر مجھے یہاں شکار کرنے کی اجازت دے دو۔''

بیس یا تیس بندر فوراً اس کے لیے پھل اور جنگلی پپیتے لانے چل دیے لیکن یہ سب لے کر واپس ہوتے وقت وہ آپس میں ہی جھگڑنے لگے۔ کسی طرح بہت جھنجھٹوں کے بعد وہ لوگ بچے کھچے تھوڑے سے پھل لائے۔

موگلی تیز بھوک اور کھانا ملنے میں دیر ہونے کی وجہ سے بہت جھلا گیا تھا۔ وہ پورے شہر میں بھالو دادا کی سکھائی ہوئی اجنبیوں کی شکار آگہی دیتا ہوا گھوما، لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ موگلی کو محسوس ہوا کہ وہ سچ مچ کسی بہت خراب جگہ آپہنچا ہے۔ ''بھالو دادا نے بندروں کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست ہے۔'' اس نے اپنے دل میں سوچا۔ ان کا قانون نہیں ہے، کوئی شکار آگاہی نہیں ہے اور کوئی رہنما نہیں ہے۔ ان کے پاس بیوقوفی کی باتوں اور چوری کرنے والے چھوٹے ہاتھوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اگر میں یہاں بھوکا مروں یا مار ڈالا جاؤں تو یہ میرا ہی قصور ہوگا۔ مجھے اپنے جنگل کی طرف لوٹنے کی فکر کرنی چاہیے۔ بھالو دادا مجھے ضرور پیٹے گا، لیکن یہاں بندروں کے ساتھ گلاب کی پنکھڑیاں توڑنے سے اس کی مار کھانا کہیں زیادہ اچھا ہے۔''

وہ یہی سوچتا ہوا شہر کی دیوار کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ پھاٹک تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ بندروں نے پیچھے سے آکر اسے واپس کھینچ لیا۔ وہ سب اسے بتانے لگے کہ اسے پتہ نہیں کہ وہ کتنا خوش نصیب ہے۔ اسے تو بندروں کا ممنون ہونا چاہیے۔ اس نے ایسا نہیں کہا تھا اس لیے وہ سب اسے چٹکیاں بھی کاٹتے جا رہے تھے۔ موگلی نے اپنے دانت بھینچ لیے اور کچھ نہیں بولا۔ شور مچاتے بندروں کے ساتھ وہ لال پتھروں والے تالاب کے اوپر بنے چبوترے پر پہنچا۔ تالاب بارش کے پانی سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس چبوترے کے بیچوں بیچ ایک سنگ مرمر کی بارہ دری تھی جوان رانیوں کے لیے بنائی گئی تھی جنھیں اب تو مرے ہوئے بھی سو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ بارہ دری کا گنبد گر چکا تھا اور اس کے گر جانے سے بارہ دری کے سرنگ کا راستہ بند ہو گیا تھا جس سے ہو کر رانیاں محل سے وہاں آتی جاتی تھیں۔ بارہ دری کی دیوار جالی دار سنگ مرمر کی تھی۔ خوبصورت دودھیا سفید پتھر پر پچکاری اور نقاشی سے طرح طرح کے پھول بنے ہوئے تھے اور جب چاند پہاڑی

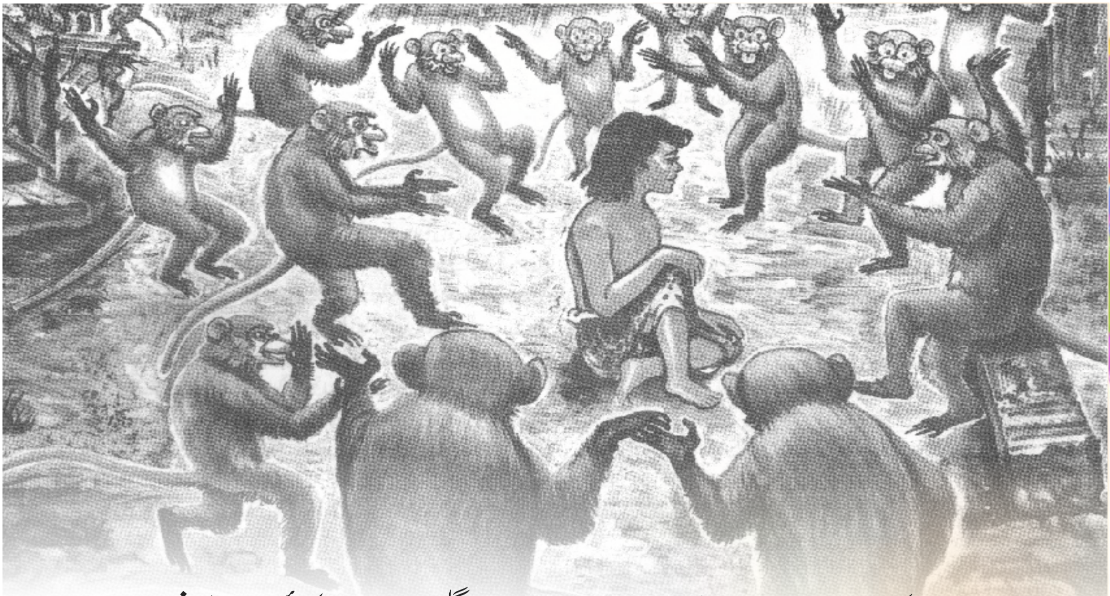

کے اوپر نکلتا تھا تو اس کی شعاعیں جالی سے ہو کر اندھیرے میں زمین پر ایسی پرچھائیاں بناتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کالی لہر روپیلی تاروں سے زردوزی کردی گئی ہو۔ جھلاہٹ ، غصے اور بھوک سے موگلی پریشان تھا، لیکن اس کے باوجود جب ایک ساتھ بیس بیس بندروں نے اسے بتانا شروع کیا کہ بندر لوگ کتنے عقل مند، طاقتور، عظیم اور مہذب ہیں اور انھیں چھوڑنے کی خواہش کرنا اس کی کتنی بڑی بیوقوفی ہے تب اسے ہنسی آئے بنا نہ رہ سکی۔

''ہم لوگ عظیم ہیں۔ ہم لوگ آزاد ہیں۔ ہم لوگ نرالے ہیں۔ ہم جنگل میں سب سے زیادہ انوکھے ہیں اور یہ بات ایک دن ضرور سچ ثابت ہوگی۔'' سب بندر ایک ساتھ چلائے۔ ''تم ہماری باتیں سننے والے ایک نئے شخص ہو۔ تم ہمارے الفاظ جنگل کے دوسرے جانوروں تک پہنچا سکتے ہو، تاکہ وہ مستقبل میں ہماری طرف توجہ مبذول کریں۔ ہم لوگ اب اپنی عظمت کے بارے میں تمھیں بتائیں گے۔''

موگلی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چبوترے پر سینکڑوں کی تعداد میں بندر جمع ہوگئے تاکہ وہ اپنے مقرروں کو بندروں کی ستائش اور تعریف کرتے ہوئے سن سکیں۔ جب کوئی مقرر بولتے بولتے دم لینے کے لیے، رک جاتا تھا تب وہ سب چلاتے تھے۔ یہ سب سچ ہے۔ ہم سبھی ایسا کہتے ہیں۔'' موگلی آنکھیں جھپکائے ہوئے اپنی گردن ہلاتا جاتا تھا اور جب وہ سب اس سے کوئی سوال پوچھتے تب وہ ''ہاں'' کہہ دیتا تھا۔ دراصل، مارے شور کے اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ ''تباکی (ایک مخصوص گیدڑ کا نام) نے ضرور ران سبھوں کو کاٹ لیا ہوگا۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''اور تبھی سے ان پر پاگل پن سوار ہے۔ یقیناً یہ پاگل پن ہے۔ کیا یہ کبھی سوتے نہیں؟ آسمان پر ایک بادل کا ٹکڑا چاند کو ڈھکنے آرہا تھا۔ کاش! یہ بادل ذرا اور بڑا ہوتا تو میں اندھیرے میں بھاگ نکلتا۔ لیکن ان بندروں کی دھما چوکڑی اور پاگل پن کی وجہ سے میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں۔

شیت نگر کی خوفناک لڑائی

ادھر شہر کی دیوار کے نیچے کی کھائی میں بیٹھے موگلی کے دو سچے دوست بادل کے اسی ٹکڑے کو ایسی ہی پس وپیش سے دیکھ رہے تھے۔ بگھیرا اور 'قا' دونوں خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ بندر بہت بڑی تعداد میں ہونے پر انتہائی خوفناک ہو جاتے ہیں اور اس لیے وہ دونوں کسی طرح کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ جب تک ایک ایک دشمن کے مقابلے کم سے کم سو سو بندر نہ ہوں تب تک بندر جنگ نہیں کرتے اور جب ایک کے مقابلے سو بندر ہوں تب ان سے لڑنے کی بات جنگل میں شاید کوئی نہیں سوچتا۔

''میں پچھمی دیوار کی سمت جا رہا ہوں۔'' 'قا' نے دھیرے سے کہا ''اور میں اس پر چڑھ کر اندر کی ڈھلوان زمین پر تیزی سے بندروں کے اوپر ٹوٹ پڑوں گا۔ وہ میرے اوپر حملہ نہیں کریں گے، لیکن۔

''یہ میں جانتا ہوں، 'قا' بگھیرا بولا۔ ''بھالو بھی ساتھ ہوتا تو لیکن خیر، ہم جو کر سکتے ہیں وہ تو کرنا ہی چاہیے۔ جب یہ بادل چاند کو ڈھانپ لے گا تب میں چبوترے پر جاؤں گا۔ وہاں وہ لڑکے کو ساتھ لے کر کوئی جلسہ کر رہے ہیں۔''

''مبارک شکار''۔ 'قا' نے بگھیرا سے کہا اور وہ پچھمی دیوار کی طرف رینگ گیا۔ اتفاق سے پچھم کی طرف دیوار سب سے کم ٹوٹی تھی۔ اس لیے اس عظیم الجثہ اژدہا کو پتھروں پر سے اوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کرنے میں کچھ ہی دیر لگی۔ تبھی بادل نے چاند کو ڈھانپ لیا۔ آگے کیا ہوگا اس کی فکر میں سوچ میں پڑے ہوئے موگلی کے سدھے ہوئے کانوں میں ٹھیک اسی وقت چبوترے پر ہلکے پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ موگلی کو اس وقت سینکڑوں بندر گھیر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس درمیان وقتی طور پر ہونے والے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کالا چیتا بغیر کسی طرح کی آواز پیدا کیے دوڑتا ہوا ڈھلان پر چڑھ آیا تھا۔ موگلی نے اسی کے پنجوں کی آہٹ سنی تھی۔ اچانک چاروں طرف سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ موگلی نے غور سے دیکھا تو اس کی سمجھ میں سب آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ بگھیرا اپنے بھاری پنجوں سے بندروں کو دائیں بائیں مار رہا تھا۔ منھ سے کاٹنے اور پھاڑنے میں اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ خوف اور دہشت کی چیخیں چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ نیچے پڑے ہاتھ پھینکتے اور چھٹپٹاتے بندروں کے اوپر کھڑے بگھیرے کے پاؤں ایک بار تو لڑکھڑا سے گئے۔ عین اسی وقت ایک بندر چلایا۔ یہ تو صرف ایک ہی ہے۔ اسے مار ڈالو، مار ڈالو۔ چاروں طرف سے ادھر ادھر چیختے ہوئے بندروں کا پورا جھنڈ ایک لہر کی طرح بگھیرا کے اوپر چھا گیا۔ دوسری جانب پانچ چھ بندروں نے موگلی کو کس کر پکڑا اور بارہ دری کی دیوار کے اوپر گھسیٹتے ہوئے لے جا کر اسے ٹوٹے ہوئے گنبد کے سوراخ میں سے اندر دھکیل دیا۔ آدمیوں کے بیچ تربیت یافتہ کوئی لڑکا اگر اوپر سے اس طرح پندرہ فٹ نیچے گرتا تو بری طرح چوٹ کھا گیا ہوتا، لیکن موگلی اسی طرح نیچے گرا جس ڈھنگ سے بھالو دادا نے سکھایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے پنجوں کے بل سیدھا ہو کر دونوں پاؤں پر زمین پر آیا۔

''جب تک ہم تیرے دوستوں کو مار نہیں ڈالتے تب تک وہیں ٹھہر بندر چلائے۔ اور اس کے بعد ہم تیرے ساتھ کھیلیں گے۔ یہ بات اور ہے کہ اس وقت تک زہریلے

لوگ تجھے شاید زندہ ہی نہ رہنے دیں۔''

''ہمارا خون ایک ہی ہے۔ میرا اور تمھارا۔ موگلی نے جلدی سے سانپوں کے خفیہ الفاظ بولتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے چاروں طرف بکھرے کوڑے میں سرسراہٹ اور پھنکار نے کی آوازیں سن رہا تھا اور سانپوں نے اس کی بات سن لی ہے، اس کا اطمینان کرنے کے لیے اس نے سانپوں کے خفیہ الفاظ کو ایک بار پھر دہرایا۔

ایسا ہی ہو۔ ہس... س... س... سب لوگ اپنے پھن نیچے کرلو۔'' لگ بھگ آدھی درجن آوازیں دھیمے لہجے میں بولیں۔ ہندوستان میں ہر کھنڈر دیر یا سویر سانپوں کے رہنے کا ٹھکانہ بن جاتا ہے اور یہ پرانی بارہ دری بھی کالے کوبرا ناگوں سے بھری ہوئی تھی۔ ''ویسے ہی ساکت کھڑا رہ، چھوٹے بھائی کیونکہ تیرے پاؤں سے ہمیں چوٹ پہنچ سکتی ہے۔''

موگلی بارہ دری کی جالیوں کی طرف نگاہیں گاڑے اور بگھیرا کے چاروں طرف ہورہی لڑائی کا خوفناک شور سنتا ہوا بغیر ہلے جلے جتنا ساکت وسالم کھڑا رہ سکتا تھا، کھڑا رہا۔ بندروں کی للکار، کھکھیانا اور ریل پیل اور پھر پیچھے ہٹ کر جھک کر اور گھوم کر اور دشمن کے اجتماع میں گھس کر وار کرتے بگھیرا کی گہری اور ڈراؤنی غراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اپنی زندگی میں پہلی بار آج بگھیرا اپنی جان کے لیے جنگ کررہا تھا۔

''بھالو دادا بھی ساتھ ہوگا، بگھیرا تنہا نہیں آیا ہوگا۔ موگلی نے سوچا۔ وہ زور سے چلایا۔ ''تالاب میں بگھیرا تالاب میں گھس جا۔ کود جا پانی میں کود جا۔

بگھیرا نے سنا اور سمجھ گیا کہ موگلی محفوظ ہے۔ اس کی

اطلاع دینے کی اس آواز نے گویا اس میں نیا حوصلہ دیا۔ ایک ایک انچ پر بھیانک مزاحمت کا مقابلہ کرنے اور جان کی بازی لگا کر راستہ بناتے ہوئے وہ تالاب کی طرف بڑھنے لگا۔تبھی جنگل کے سب سے نزدیک والی دیوار کی جانب سے بھالو کا اعلان جنگ گڑگڑاتا ہوا گونج اٹھا۔ بوڑھے بھالو دادا کو اپنی انتھک کوششوں کے باوجود دیر ہوگئی تھی۔بگھیرا! یہ خوب زور سے چلا کر بولا۔''میں یہاں ہوں۔ میں چڑھ رہا ہوں۔ میں آپہنچا۔ آ... ہارا! میرے پیروں کے نیچے سے پتھر کھسکے جارہے ہیں۔ارے بدمعاش بندرو! ذرا میرے آنے تک ٹھہروتو'' کسی طرح ہانپتا ہوا وہ چبوترے پر چڑھا ہی تھا کہ بندروں کی امنڈتی ہوئی لہر میں سر تک ڈوب گیا۔اب وہ اپنے پچھلے پیروں پر جم کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ ایک بار میں بڑھا کر جتنے بندر ہاتھ میں آسکے،انھیں سمیٹ کر ٹھپ... ٹھپ... کرکے اپنے تیز موٹے ناخن والے بڑے بڑے پنجوں سے ٹھونکنا شروع کردیا۔تبھی پانی میں کوئی چیز دور سے گرنے اور پھر چھپاکے کی آواز سے موگلی سمجھ گیا کہ بگھیرا لڑھکتا ہوا کسی طرح تالاب تک پہنچ گیا ہے جہاں بندر اس کا پیچھا نہیں کرسکتے۔ وہ قوی الجثہ کالا چیتا تالاب کے بیچ پانی میں صرف سر نکالے زور زور سے سانس لینے کی کوشش کررہا تھا۔ادھر تالاب کی لال پتھروں والی سیڑھیوں پر غصے سے ابلتے ہوئے بندروں کی بھیڑ اچھل کود رہی تھی۔ اگر بگھیرا بھالو دادا کی مدد کے لیے باہر آیا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑنے کو آمادہ بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ایسی حالت میں بہت ناامید اور مجبور ہوکر بگھیرا نے اپنی بھیگی ہوئی ٹھوڑی پانی سے اوپر اٹھائی۔اسی ناامیدی اور بے بسی کے عالم میں اس کے منھ سے سانپوں کے خفیہ الفاظ اور حفاظت کی پکار نکل پڑی۔ ہم ایک ہی خون کے ہیں، تو اور میں اسے یقین ہوچلا تھا کہ قا نے عین موقعے پر دھوکا دے دیا ہے۔ کالے چیتے کو سانپوں سے مدد کی درخواست کرتے سن کر اور تو اور بھالو بھی جس کا آدھا جسم بندروں نے نوچ ڈالا تھا، بغیر ہنسے نہیں رہ سکا۔

'قا' اسی وقت پچھمی دیوار سے چڑھ کر بڑی مشکل سے نیچے آسکا تھا اور نیچے اترتے وقت اس نے اتنی قوت لگائی تھی کہ ایک بڑا بھاری پتھر اکھڑ کر نیچے خندق میں گر گیا۔اس نے دو ایک بار کنڈلی مار کر یہ تسلی کرلی تھی کہ اس کئی گز لمبے بدن کا ایک ایک فٹ پوری طرح سے کام کررہا ہے۔ ادھر اس دوران بھالو دادا کے ساتھ بندروں کی جنگ جاری تھی اور پانی میں پڑے بگھیرا کو تالاب کے چاروں طرف گھیرا بنا کر بیٹھے بندروں کا للکارنا اور چلانا بھی جاری رہا۔ چمگادڑوں نے سب طرف گھوم گھوم کر اس عظیم جنگ کی خبر جنگل بھر میں پھیلا دی تھی اور اس خبر کو سن کر گجراج (جنگلی ہاتھی) بھی چنگھاڑ اٹھا۔ جنگل میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے بندر جاگ گئے اور وہ سب بھی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے درختوں کے راستے چھلانگ لگاتے بندر نگری میں آپہنچے۔ جنگ کے ہنگامے سے ادھر ادھر میلوں تک کے پرندے گہری نیند سے جاگ اٹھے تھے۔

■

ماخذ: جنگل کی کہانی: رمیش نارائن تیواری، **مترجمہ:** زینت شہریار، **دوسری اشاعت:** 2022 **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

جے پرکاش بھارتی

خلا کے مسافر

اخبار میں آئے دن خلائی سفر کے بارے میں خبریں چھپتی ہیں۔ اکثر تصویریں بھی شائع ہوتی ہیں، اس دن بھی ایسی ہی ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ راکیش نے پڑھا تو اس نے خلا کے بارے میں جاننا چاہا۔ رات کے وقت دادا جی سے اس کے بارے میں بتانے کے لیے کہا۔

رچنا بولی ”دنیا کا سب سے پہلا خلائی مسافر یوری گگارن تھا اور ایک خاتون بھی خلا کا سفر کر چکی ہیں۔ ان کا نام ہے ویلن تینا تریش کووا۔“

راکیش نے پوچھا ”لیکن پہلے تو بتاؤ کہ خلا ہے کہاں۔“ رچنا کو اس سوال کا جواب نہ بن پڑا۔

دادا جی بولے ”یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ زمین کے اوپر ہر جگہ ہوا کا دباؤ ہے۔ جیوں جیوں ہم اوپر کی طرف جاتے ہیں، ہوائی کرہ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ تین میل کی اونچائی پر زمین کی سطح کے مقابلے میں ہوا کا دباؤ آدھا رہ جاتا ہے۔ ہمیں جلدی جلدی سانس لینا پڑتی ہے۔ اسی لیے تم نے سنا ہوگا کہ اونچے پہاڑوں پر چڑھنے والوں کو اپنے ساتھ آکسیجن لے جانی پڑتی ہے۔ دس بارہ میل کی اونچائی سے آگے آسمان بالکل پرسکون ہوتا ہے۔ اس میں نہ آندھی طوفان آتے ہیں اور نہ بادل ہوتے ہیں۔ ویسے دوسو میل کی اونچائی تک ہمارا ہوائی کرہ پھیلا ہوا ہے۔“

دادا جی لمحہ بھر کو رکے۔ پھر بتانے لگے ”چار سو میل سے اوپر صرف گیس کی پرت ہے، جس کے ہونے نہ ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس جگہ پر اور اس سے اوپر دور تک خلا پھیلا ہوا ہے، خلا کتنا اونچا اور کتنا چوڑا ہے یہ ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔“

راکیش سمجھ گیا تھا۔ بولا ”تو زمین کے ہوائی کرہ

کے اوپر دور دور تک پھیلی خالی جگہ (صفر) ہی کو خلا کہا جاسکتا ہے۔''

دادا جی بولے ''ٹھیک ہی کہا تم نے، لیکن آج خلا کا مطلب ہے پوری کائنات، کیونکہ اب یہ مانا جاتا ہے کہ خالی جگہ (صفر) کہیں بھی نہیں ہے۔''

چھایا کو یہ باتیں زیادہ دلچسپ معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ بولی ''ہمیں تو اس بارے میں بتایئے کہ روسی لڑکی کب اور کیسے خلا میں گئی۔''

دادا جی بولے ''میں تمھیں سب کچھ شروع ہی سے بتاتا ہوں۔ خلا کی سیر سب سے پہلے انسان نے نہیں کی، بلکہ لائیکا نامی ایک 'کتیا' نے کی تھی۔ روس نے 3 نومبر 1957 کو اس کتیا کو خلا میں بھیجا تھا۔ لائیکا ایک ہفتہ تک زندہ رہی۔ اس کے بعد خلا میں دو کتے بھیجے گئے۔ امریکہ نے دو بندر خلا میں بھیجے۔ روس نے ایک خرگوش بھیجا۔ اس کے بعد پھر دو کتے بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ خرگوش، چوہے اور کچھ کیڑے بھی تھے۔''

رچنا نے پوچھ لیا ''یہ ہوائی جہاز میں بھیجے گئے ہوں گے؟''

دادا جی بولے ''نہیں نہیں، خلائی سفر ہوائی جہاز میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے طیارہ یا خلائی جہاز چھوڑے جاتے ہیں، ان میں راکٹ لگے ہوتے ہیں۔''

''چھایا بولی'' دادا جی۔ کیا آپ نے ایسا جہاز دیکھا ہے؟ ہمیں بھی دکھایئے اور اس کے بارے میں بتایئے۔''

دادا جی نے کہا ''پہلے ہم خلائی سفر کے بارے میں جان لیں۔ پھر اس کے بارے میں باتیں کریں گے۔

اس طرح بہت سے کتے، خرگوش، چوہے اور دوسرے جانور خلا میں بھیج کر تجربے کیے گئے۔ یہ سب انسان کو خلا میں بھیجنے کی تیاری تھی۔

اس کے بعد 12 اپریل 1961 کا دن آیا۔ اس دن دوستوپ نامی جہاز میں میجر یوری گگارن نے اڑان بھری۔ جہاز کا وزن پانچ ٹن تھا۔ زمین کا ایک چکر کاٹ کر وہ بخیر و خوبی لوٹ آئے۔ اس اڑان میں کل ایک سو آٹھ منٹ کا وقت لگا۔

گگارن کے اس جہاز کی رفتار بہت تیز تھی، 17 ہزار میل فی گھنٹہ۔

گگارن نے جب اڑان بھری تھی، اس وقت وہ 27 برس کے تھے، لیکن بچپن سے ہی وہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ کر گھنٹوں آسمان کو دیکھا کرتے تھے۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انھوں نے جولے ورن کی لکھی سائنسی کہانیاں پڑھیں۔ جولے ورن کے بارے میں تو میں تمھیں بتا بھی چکا ہوں، کیوں چھایا۔''

چھایا ہنسی ''جنھوں نے توپ داغ کر چاند پر آدمی بھیجنے کی کہانی لکھی ہے'' دادا جی بولے ''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے اور میں تمھیں ایک بات اور بتا دوں۔ تم کاغذ کے ہوائی جہاز اڑایا کرتے ہو نا۔ جب گگارن نوعمر تھے، تب انھوں نے ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز بنایا تھا۔ انھوں نے جب اسے اڑایا تو وہ راہ چلتے ایک گنجے آدمی کی چاند سے جا ٹکرایا۔ وہ آدمی بہت بگڑا۔''

دادا جی پھر بتانے لگے ''لیکن وہ ہوائی جہاز تمھارے کاغذی ہوائی جہاز جیسا نہ تھا۔ وہ تو مانو اصلی ہوائی جہاز کا چھوٹا سا نمونہ ہی تھا۔ گنجا آدمی گگارن پر بگڑا ضرور۔ لیکن جب وہ ہوائی جہاز اس نے دیکھا۔ تب اس نے گگارن کی سوجھ بوجھ کی تعریف کی۔

گگارن نے اپنی اڑان کے وقت بے وزنی کو محسوس بھی کیا۔ اس وقت زمین کی کشش ثقل کی طاقت کا اثر ان پر نہیں پڑ رہا تھا۔ انھیں لگا جیسے ہاتھ پاؤں رہے ہی نہ ہوں۔ ایک پینسل جب لاپروائی سے انھوں نے میز پر رکھی تب وہ ہوا میں تیرنے لگی۔''

رچنا نے پوچھا ''گگارن کے بعد کون کون خلا میں گیا۔''

دادا جی بولے ''گگارن کی کامیاب اڑان کے 23 دن بعد امریکہ کے باشندے شیپرڈ نے اڑان بھری، لیکن وہ 15 منٹ ہی اڑان بھر سکے۔ صرف ایک سو پندرہ میل کی اونچائی تک پہنچ کر ان کا جہاز سمندر کی سطح پر آ گرا۔

6 اگست 1961 کو میجر تتو نے دوستوک 2 خلائی سفر کیا۔ انھیں 25 گھنٹے 18 منٹ لگے۔ انھوں نے اتنے وقت میں جو فاصلہ طے کیا وہ اتنا ہی تھا جتنا زمین سے چاند تک جانے آنے میں طے کرنا پڑتا۔ انھوں نے 17 بار زمین کا چکر لگایا۔ سب سے پہلے امریکی خلائی مسافر جان گلین تھے۔ انھوں نے 20 فروری 1962 کو اڑان بھری۔ زمین کے تین چکر لگائے۔

ان دنوں خلا میں انسان کی اڑان کا جیسے تانتا ہی لگ گیا۔ جن لوگوں نے ان دنوں خلائی سفر کیے وہ کارپینٹر نکالیو، پوپووچ، والٹر شرا، گورڈن کوپر اور والیری وائی کووسکی تھے اور پھر 16 جون 1963 کو روسی لڑکی ویلن تینا تریش کووا نے خلا کا سفر کیا۔''

دادا جی کی یہ بات سن کر چھایا اور رچنا مسکرا اٹھیں۔

دادا جی نے آگے بتایا ''تریش کووا نے تقریباً 80 گھنٹے کی اڑان کی۔ وہ 48 چکر کاٹنے کے بعد بخیریت زمین پر لوٹ آئی۔ تریش کووا کا خلائی جہاز ووستوو 6 تھا۔ اس سے دو دن پہلے دوسرے جہاز میں ایک دوسرا روسی

مسافر بھی خلائی سفر کر رہا تھا۔ ترلیش کووا کے کچھ ہی گھنٹے بعد وائیکو وسکی نامی یہ مسافر بھی زمین پر خیریت سے لوٹ آیا۔

اب تو ایک ہی خلائی جہاز میں دو دو تین تین مسافر بھی ساتھ بھیجے جانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سفر کا وقت بھی بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دسمبر 1965 میں دو امریکی مسافروں نے تو تقریباً 14 دن تک خلائی سفر کیا۔ انھوں نے زمین کے 120 چکر کاٹے۔''

دادا جی جیسے کہانی میں کہانی جوڑے جا رہے تھے۔ ''آدمی کے حوصلے کی کوئی حد نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خلا میں نئے نئے تجربے ہوتے رہے۔ شروع میں خلائی مسافر اپنی کرسی پر بندھا بیٹھا رہتا تھا۔ پھر اس نے جہاز کے اندر خاطر خواہ طریقے سے تیرنا شروع کیا۔ وہ بہت سے کرتب کرنے لگا۔ یہاں تک کہ سونے بھی لگا اور اس کے بعد اس نے جہاز سے باہر لامحدود خلا میں گھومنا بھی شروع کر دیا۔ سب سے پہلے کرنل لیونو و کھلے خلا میں کودے تھے۔ وہ بیس منٹ تک جہاز سے باہر رہے اور پھر خیریت سے جہاز میں لوٹ آئے۔''

یکا یک راکیش نے سوال پوچھ لیا ''دادا جی خلا میں تو آدمی نے کافی اچھل کود کر لی، لیکن اس سے ہوا کیا۔''

رچنا بولی ''کیا اس سے انسان کے حوصلے کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی نئی جانکاری بھی حاصل کر لی۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ اڑنے والوں کو بے وزنی کی حالت میں چلنے پھرنے کا تجربہ ہوا۔ اس کے علاوہ خلائی پوشاکوں کی جانچ بھی ہو گئی۔ یہ ثابت ہو گیا کہ خلائی پوشاکیں وکرن کو اچھی طرح سہہ سکتی ہیں۔ اس طرح ان کا استعمال کر کے انسان اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتا ہے۔''

دادا جی نے کہا ''اصل میں اسے ہم چاند کے سفر کی تیاری کہہ سکتے ہیں۔ جو بھی مسافر خلا میں گئے، وہ تو خلا کے مہمان ہی تھے۔ گئے اور کھوج بین کر کے وہاں کی کیفیت کو سمجھ کر لوٹ آئے۔

تم لوگ ریل کا سفر کرتے ہو تو بیچ میں اسٹیشن پڑتے ہیں۔ آگے کے سفر کے لیے خلا میں اسٹیشن بھی بنانے پڑیں گے۔''

اسٹیشن کیسے ہوں گے۔ دادا جی اس بارے میں بھی شاید کچھ بتانا چاہتے تھے کہ ان کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

■

ماخذ: چلو چاند پر چلیں، **مصنف**: جے پرکاش بھارتی
تیسری طباعت: 2009
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تاریخی، سائنسی اور ثقافتی معلومات

معلوماتِ عامہ بچوں کے کیریئر اور مستقبل سازی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنرل نالج پوری دنیا سے جوڑنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی کے ذریعے مسابقہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں، اس لیے بچے اگر ابھی سے تاریخ، ادب وثقافت، سماج اور سائنس کے موضوعات اور معلومات پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو مستقبل میں ان کے لیے راہیں آسان ہو جائیں گی۔

1. ایم سی ڈی کا فل فارم کیا ہے؟
2. ایشیا کے سب سے بڑے ریلوے نیٹ ورک کا نام بتائیں؟
3. ایک ٹن میں کتنے کلوگرام ہوتے ہیں؟
4. برہمو سماج کا بانی کون ہے؟
5. جلیاں والا باغ میں فائرنگ کا حکم کس نے دیا تھا؟
6. بارش کے پانی میں کون سا وٹامن ہوتا ہے؟
7. انسانی جسم میں کتنی ہڈیاں ہوتی ہیں؟
8. ایسے پتھر کا نام بتائیں جو پانی میں نہیں ڈوبتا ہے؟
9. ہندوستانی نوٹ پر کس کا دستخط ہوتا ہے؟
10. طوطیِ ہند کس کا لقب ہے؟
11. بین الاقوامی یوم خواتین کب منایا جاتا ہے؟
12. ایشیا میں کتنے ممالک ہیں؟
13. دنیا میں سب سے زیادہ جھیلیں کس ملک میں ہیں؟
14. Birdman of India کسے کہا جاتا ہے؟
15. 2022 کے ایشین گیمز کی میزبانی کس شہر نے کی تھی؟
16. دماغ کے سوچنے والے حصے کو کیا کہا جاتا ہے؟
17. دنیا کی سب سے لمبی گھاس کا نام کیا ہے؟
18. جسم کے دو اعضا جو کبھی آرام نہیں کرتے؟
19. گارڈن سٹی آف انڈیا کس شہر کو کہا جاتا ہے؟
20. عیدگاہ کہانی کس نے لکھی ہے؟

(جواب صفحہ نمبر 46 پر ملاحظہ فرمائیں)

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

—مرزا غالب

میری گھٹی میں پڑی تھی ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسن بیاں بنتا گیا

—فراق گورکھپوری

ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے لیکن
طوفان سے لڑنے میں مزہ اور ہی کچھ ہے

— آل احمد سرور

کیف پردیس میں مت یاد کرو اپنا مکاں
اب کے بارش نے اسے توڑ گرایا ہوگا

— کیف بھوپالی

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

—بشیر بدر

تم چلو اس کے ساتھ یا نہ چلو
پاؤں رکتے نہیں زمانے کے

—ابوالمجاہد زاہد

کوشش بھی کر امید بھی رکھ راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

—ندا فاضلی

آج بھی شاید کوئی پھولوں کا تحفہ بھیج دے
تتلیاں منڈلا رہی ہیں کانچ کے گلدان پر

—شکیب جلالی

مدتوں بعد میسر ہوا ماں کا آنچل
مدتوں بعد ہمیں نیند سہانی آئی

—اقبال اشہر

ہار ہو جاتی ہے جب مان لیا جاتا ہے
جیت تب ہوتی ہے جب ٹھان لیا جاتا ہے

— شکیل اعظمی

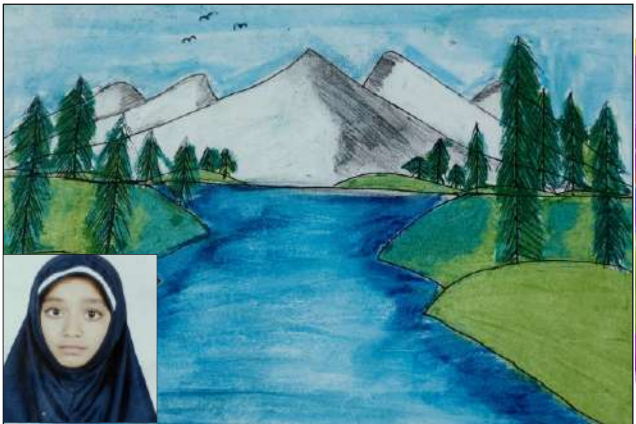

ام کلثوم پیرزادے، درجہ ہفتم، الہدیٰ اردو پرائمری اینڈ ہائی اسکول، وجے پور، کرناٹک

زینہ حریم، درجہ اول، ہیریٹیج انٹرنیشنل اسکول ناگپور (مہاراشٹر)

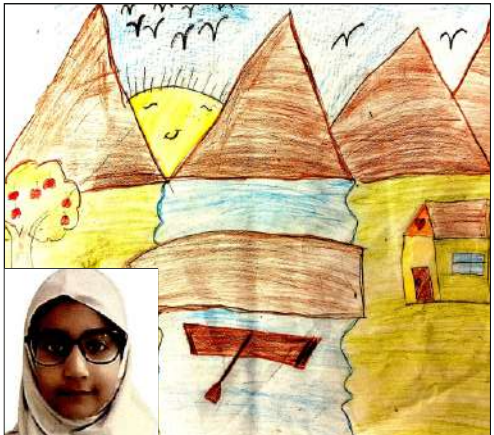

منیبہ مجاہد، درجہ دوم، دی اسکالر اسکول، نئی دہلی

طیبہ شاہد بنت محمد شاہد، درجہ دوم، فاطمہ میموریل چلڈرنس اسکول، چندوارہ، مظفر پور، بہار

محمد حنظلہ درجہ سوم، اولیوا اکیڈمی چلما پور، گورکھپور، یوپی

صالحہ قاسم، درجہ چہارم، الہدیٰ اردو پرائمری اینڈ ہائی اسکول، وجے پور، کرناٹک

شاہی عالم، درجہ سوم، دارالہدیٰ اسلامیہ اکیڈمی، بھیم پور، ویسٹ بنگال

شاہ آفرین رفیق، درجہ ہفتم، ضلع پریشد اردو اسکول کسارے، تعلقہ ساکسری، ضلع دھولیہ، مہاراشٹر

نیاز علوی، درجہ ششم، ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی

اکرم چوہان، درجہ ششم، ہمدرد پبلک اسکول، نئی دہلی

ذکیہ قاسم، درجہ ہفتم، الہدیٰ اردو پرائمری اینڈ ہائی اسکول، وجے پور، کرناٹک

محمد شارق محمد شاکر، درجہ ہشتم نیشنل ہائی اسکول، دھولے، مہاراشٹر

زوبیہ فاطمہ عبدالقادر صدیقی، درجہ دوم
گورنمنٹ اردو ہائر سیکنڈری اسکول برہانپور، مدھیہ پردیش

عنایہ فاطمہ، درجہ پنجم، سینٹ ٹریسا سیکنڈری اسکول، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتہ (مغربی بنگال)

رقیہ سراج الدین چودھری، درجہ پنجم، المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول، پواربستی، چکھلی، پونہ، مہاراشٹر

زیان راشد قاضی، درجہ ہشتم، نیشنل ہائی اسکول، دھولے، مہاراشٹر

زیان راشد قاضی، درجہ ہشتم، نیشنل ہائی اسکول، دھولے، مہاراشٹر

صفیع اللہ قریشی، آرمی گڈول اسکول بونیار، جموں وکشمیر

دانیہ عبدالرحیم، درجہ سوم، المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول، پواربستی چکھلی، پونہ، مہاراشٹر

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

قلمکاروں سے گذارش ھے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, मार्च 2025, वर्ष 13, अंक 03
BACHON KI DUNIYA Monthly, March 2025 Vol. 13, Issue: 03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/02/2025
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

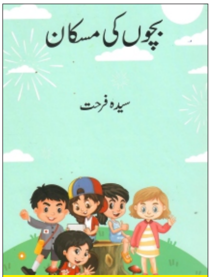

صفحات: 64، قیمت: 25 روپے

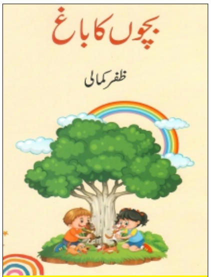

صفحات: 50، قیمت: 20 روپے

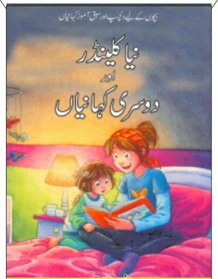

صفحات: 43، قیمت: 15 روپے

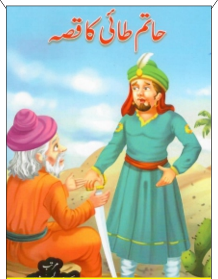

صفحات: 86، قیمت: 30 روپے

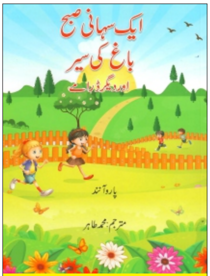

صفحات: 101، قیمت: 35 روپے

صفحات: 108، قیمت: 95 روپے

صفحات: 22، قیمت: 25 روپے

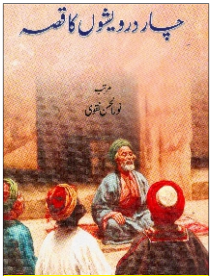

صفحات: 70، قیمت: 30 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B - 127, Sector 65, Noida, U.P
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.